ظفر برادرس تاجرانِ کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلۂ تالیفات ۲۷

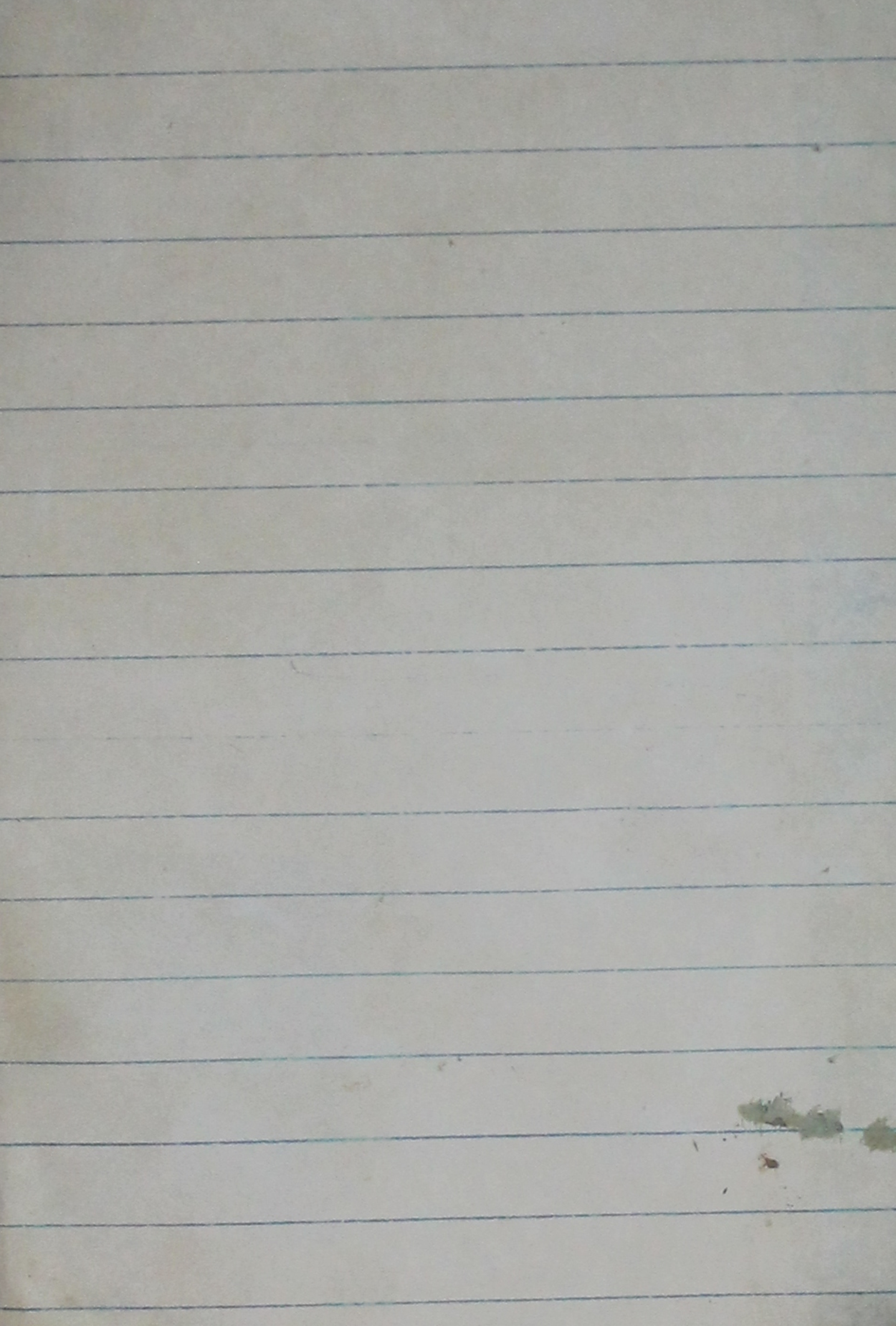
لاہور عہدِ مغلیہ میں

محمد الدین فوق

قیمت ۸/

سنہ ۱۹۳۷ء

بار اوّل



دیباچہ

سنہ ۱۹۲۳ء و سنہ ۱۹۲۴ء کے شباب اردو (لاہور) اور صوفی (پنڈی بہاؤالدین) میں میرے چند مضامین لاہور کے متعلق چھپتے رہے۔ اس زمانہ میں بعض احباب نے ان مضامین کو کتابی صورت میں چھاپنے کا مشورہ دیا۔ اسکے بعد سنہ ۱۹۲۶ء میں رسالہ قوس قزح (لاہور) کے سالانہ نمبر میں جب میرا مضمون "شباب لاہور" کے عنوان سے چھپا۔ تو اکثر خطوط ایسے آئے کہ یہ ایک مکمل اور جامع مضمون ہے۔ اس کو ضائع نہ ہونا چاہیئے۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ ان تاریخی شکرپاروں کو اپنے اپنے موقع پر "تاریخ لاہور" کے صفحوں میں جگہ دیدونگا۔ لیکن نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ لاہور جس کا بہت سا بے ترتیب حصہ منتشر طور پر لکھا ہوا موجود بھی ہے۔ کب مکمل ہو۔ اس لئے اس خیال سے کہ یہ تاریخی مضامین ضائع نہ ہوجائیں۔ اور ان احباب کی فرمایش بھی پوری ہو جائے۔ جو ازراہ قدردانی میرے ناچیز تاریخی مضامین کو پسند فرماتے ہیں۔ میں نے ان مضامین کو بعنوان "لاہور عہد مغلیہ میں" کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ لاہور عہد مغلیہ میں کس شباب و عروج پر تھا۔ اُس کی مفصل کیفیت میری "تاریخ لاہور" کے حصہ دوم "شباب لاہور" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوسکیگی جس میں شاہی عمارات و باغات اور شہر کی رونق و آبادی اور لاہور کی پولٹیکل اور علمی زندگی کے علاوہ اُس زمانہ کے علماء۔ اُمراء و وزراء اور شعراء اور گورنروں کے دلچسپ حالات بھی ہوں گے۔ اور جس کا حجم انشاءاللہ تین چار سو صفحہ سے کم نہ ہوگا۔

محمد الدین فوق

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء
دفتر اخبار کشمیری لاہور

شباب لاہور

از خامۂ جاں طراز حضرت فوقؔ مدظلہ۔ مؤرخ پنجاب و کشمیر

لاہور کی تاریخ جس حد تک حضرت فوقؔ کے قلم کی مرہونِ منت ہے اتنی اور کسی مورخ کے قلم کی نہیں۔ یہ موصوف ہی کی بدولت ہے کہ لاہور کے وہ تاریخی مقامات جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکے ہیں ایک دفعہ پھر اپنی گذشتہ عظمت کو لئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لاہور کا کونسا ایسا تاریخی مقام ہے جس کے مٹے ہوئے نشانات اور پریشان ذرات میں جنابِ فوقؔ کی جان طرازیاں مصروفِ عمل نہ ہوں۔ جناب ممدوح نے کمال نوازش سے اس تاریخ کی پہلی قسط "قوس قزح" کو مرحمت فرمائی ہے ———— (گیلانی)[1]

عہدِ بابری

بابر نے سنہ ۱۵۲۴ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک تین بار لاہور پر حملہ کیا ہے۔ پہلے حملہ میں اس نے برافروختہ ہو کر اپنی فوج کو شہر کے لوٹنے کی اجازت دی۔ فوج نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کا کچھ حصہ جلا بھی دیا۔ اس کے واپس چلے جانیکے بعد دولت خاں لودھی حاکم لاہور نے بابر کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ بابر دومرتبہ آیا۔ اور آخری

[1] منشی محمد وحید صاحب گیلانی ایڈیٹر رسالہ قوس قزح لاہور

مرتبہ تو لاہور اور سرہند سے گذر کر پانی پت پر افغانوں کے ساتھ ایک عظیم جنگ کی جس میں سلطان ابراہیم مارا گیا۔

مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں کیا قائم ہوئی۔ کہ دہلی۔ آگرہ وغیرہ مقامات کے ساتھ ہی لاہور کا ستارہ عروج و اقبال بھی چمک اُٹھا۔ بابر کے جانشینوں کے عہد میں لاہور نے وہ رونق حاصل کی۔ کہ اس کی آبادی اس زمانہ کے مورخین کے قول کے مطابق نو سے بارہ میل کے اندر تھی۔

بابر کے جانشینوں کے زمانہ میں جو کیفیت لاہور کی رہی ہے۔ اس کا مجمل سا بیان یہاں کیا جاتا ہے۔

دورِ ہمایونی

ہمایوں نے کابل۔ قندھار اور پنجاب اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کامران کو دیدیئے۔ کامران نے سب سے پہلے لاہور میں خوشنما عمارات کی طرح ڈالی۔ تھارنٹن صاحب کے قول کے مطابق ایک عالیشان محل معہ ایک وسیع باغ کے جو نو لکھا سے راوی تک پھیلا تھا۔ تعمیر کرایا۔ اب اس باغ اور محل کا کہیں نشان تک نہیں اس کے علاوہ دریا کے پار ایک اور عالیشان باغ اور خوبصورت بارہ دری کی بنیاد رکھی۔ اسی بارہ دری میں جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو کو ۱۶۰۶ء مطابق سنہ ۱۰۱۴ھ میں بغاوت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ اس بارہ دری کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے۔ جس کی شکستہ دیواریں دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں۔

کامران مرزا نے اپنے عہد میں لاہور کو بیحد رونق دی جب سنہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کو شکست دی۔ تو وہ اپنے بھائی کے پاس لاہور میں چلا آیا تھا۔

جب شیر شاہ کے خوف سے کامران کابل کو بھاگ گیا اور ہمایوں جو جیر

اور رجستان کے جنگلوں اور ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا ایران کو بھاگا۔
تو شیر شاہ بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس نے اپنی پنجسالہ
حکومت میں رفاہ عام کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر لاہور چونکہ مغلوں
کا مرکز تھا۔ اس لئے اسے لاہور سے خاص عداوت تھی۔ اس نے لاہور کو تباہ
کر کے اس کی بجائے سیالکوٹ کو پنجاب کا دار الخلافہ مقرر کرنا چاہا۔ مگر موت
نے اسے مہلت نہ دی۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مرتے وقت اس نے اپنی
خواہش کے پورا نہ ہونے پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔[1]

عہدِ اکبری

چودہ[۱۴] سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۵۵۴ء میں ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے
لاہور میں داخل ہوا۔ اہل لاہور نے اس کے واپس آنے پر دلی مسرت کا اظہار
کیا۔ اور اس شہر میں جسے شیر شاہ اور اس کا بیٹا خاک میں ملانا چاہتے تھے
عظیم پیمانہ پر چراغاں کیا گیا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کے انتقال کے بعد اکبر تخت
نشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں لاہور کو جو رونق ہر پہلو سے نصیب ہوئی اس
کے بعد عہد شاہجہانی کے سوا اور کسی عہد میں نہیں مل سکتی۔ اکبر ۱۵۸۴ء سے
۱۵۹۸ء تک یعنی کامل پندرہ سال تک لاہور کی آبادی و رونق کے لئے
لاہور میں مقیم رہا۔ عہد اکبری کے یورپین اور ہندوستانی سیاحوں اور مؤرخوں
نے لاہور کی نسبت جو لکھا ہے۔ اس کا کچھ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
مسٹر طامسن ہربرٹ نامی ایک سیاح ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا۔ اکبر ان
دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ وہ لکھتا ہے "لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے

---

[1] تاریخ پنجاب۔ جج محمد لطیف صفحہ ۲۵

کسی شہر سے ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا سال کے ۸ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے۔ بازار اچھے۔ بارونق اور پختہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے دریائے راوی کے ذریعہ جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے صاف کیئے جاتے ہیں۔ یہاں کی قابلِ دید عمارات میں سے قلعہ۔ محلات۔ حمام تالاب۔ باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔ قلعہ بہت بڑا ہے۔ جسے اکبر نے اپنے قیام لاہور کے ایام میں پختہ خشتی بنوایا۔ اور اس میں فلک شگاف عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قلعہ کے بارہ چوردروازے ہیں۔ جن میں سے تین کا منہ شہر کی طرف ہے اور نو کا باہر جنگل کی طرف[1]۔"

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لاہور کے متعلق لکھتا ہے۔" لاہور بزرگ شہر لیست میانِ دوآبہ باری۔ در بزرگی و انبوہ مردم کم ہمال۔ ودریں دولت ابد پیوند قلعہ و ارک او از خشت پختہ ساختہ اند۔ و چوں چند گاہ پایۂ تخت شدہ والا کاخہا برافراختہ آمد۔ و دلکشا باغ ہا شادابی دیگر بخشید و گوناگوں مردم بر شہر راہ بیگاہ شد۔ و شگرف کارہا بہر ساختند و در انبوہی و بزرگی از اندازہ گذشت"۔

لاہور میں شالبافی اور پشمینہ کا کام اس کثرت سے ہوتا تھا۔ کہ لاہور اس زمانہ میں چھوٹا کشمیر معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں یہاں کی شالبافی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے" و از توجہ شاہنشاہی در لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شدہ"۔

اسی لاہور میں جہاں سولھویں صدی عیسوی میں ایک ہزار سے زیادہ شالبافی کے کارخانے تھے۔ وہاں آج بیسویں صدی میں ایک بھی نہیں ہے۔

لاہور ہی سے اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا۔ اور اسی شہر میں بیٹھ کر اقوام سرحد

---

[1] آج کل صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔ جو ڈیرہ گوردوارہ جن دیو اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل ہے۔

کی گوشمالی کی۔ اسی شہر میں اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے خیر پورہ[1] اور دھرم پورہ کے نام سے دو عظیم الشان غریب خانے (POOR HOUSES) قائم کئے۔ اسی شہر میں اکبر نے ملا احمد ٹھٹھوی کو تاریخ الفی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کو راماین۔ جامع رشیدی اور مہابھارت کے تراجم اور ملا محمد شاہ آبادی کاشمیری کو تاریخ کشمیر لکھنے کا حکم دیا۔ اسی شہر میں فیضی نے ۱۰۰۳ھ میں نل دمن کی مثنوی لکھی ۔

۱۵۹۵ء میں اکبر لاہور ہی میں تھا۔ کہ گوا سے پرتگیزی پادریوں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی۔ ان پادریوں نے اپنے دلچسپ سفر ناموں میں لاہور کی بہت تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ شہر ایسا بارونق اور آباد ہے۔ اور اس میں شاہی محلات کے علاوہ امراء و وزراء کے ایسے ایسے عالیشان مکانات ہیں کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادشاہ ان ایام میں راوی کے ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جہاں اس کے رہنے کے لئے ایک خوشنما بنگلہ بنایا گیا تھا[2]۔

لاہور میں اکبر نے سب سے پہلے سکھوں کے چوتھے گرو رامداس کی شہرت سُنی۔ اور ان سے ملاقات کی اور خوش ہو کر پانچ سو بیگھہ اراضی ان کو مرحمت کی۔ جہاں گرو صاحب نے امرتسر کی بنیاد ڈالی ۔

لاہور میں اکبر نے اپنے نام پر ایک منڈی بھی تعمیر کی۔ جسے آج تک اکبری منڈی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نیز ایک دروازہ بنایا جس کا نام اس کے نام پر اکبری دروازہ رکھا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کی موجودہ شکل بہت

---

[1] خیر پورہ کی عمارت کا کچھ حصہ اب بھی دارانگر کے قریب سڑک میانمیر کی بائیں جانب موجود ہے ۔

[2] آج کل اس جزیرہ اور بنگلہ کا نشان تک نہیں ہے ۔

تبدیل ہو چکی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہے۔ کہ صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ عمارتوں کی وضع قطع اکبری عہد کی سی نہیں ہے۔

ابوالفضل نے لاہور میں ایک عظیم الشان مکان "فضل آباد" کے نام سے تعمیر کیا۔ اسی جگہ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک نے ۱۰۰۱ھ میں انتقال کیا۔

ہمایوں کے زمانہ کے ایک بزرگ جنہوں نے سوری خاندان کے زمانہ میں بڑا عروج پایا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی پورے عروج پر تھے نام ملا عبداللہ اور خطاب مخدوم الملک تھا۔ ان کے املاک اور مکانات جو شاہی ایوانات سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ لاہور میں تھے۔ ملائے مذکور نے ان مکانات کے اندر بڑی بڑی قبریں بنوا رکھی تھیں۔ جن پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے۔ اور وہاں ہی سے چراغ جلنے لگتے تھے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی کہ یہ مقبرے اور مزار نہیں بلکہ دفینے اور خزانے ہیں۔ جب ان قبروں کو کھدوا دیا گیا۔ تو اس قدر زر و دولت برآمد ہوا کہ بادشاہ دنگ رہ گیا۔ یہ سب مال تین کروڑ روپے کا تھا۔ جو اینٹوں کی شکل میں صندوقوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ آخر یہ سب مال جو خلقِ خدا کے گلے گھونٹ کر جمع کیا گیا تھا۔ اکبری خزانہ میں داخل کر لیا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوانداس کے محلات دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے تھے۔ مگر اب ان کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم خانخاناں جس کی فیاضی و سخاوت نے حاتم کو بھی مات کر دیا تھا۔ لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کے باپ کا رفیع الشان محل لاہور کے لئے باعثِ نازش تھا۔

حکیم ہمام کے بھائی حکیم علی گیلانی کا حوض[۱] اسی لاہور میں تھا۔ جسے

[۱] بحوالہ مآثر الامراء تاریخ لاہور (انگریزی و اردو) دربار اکبری۔ تاریخ ذکاء اللہ۔

اس قابل حکیم نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں اس حکمت کے ساتھ تعمیر کیا۔ کہ بڑے بڑے انجینئر حیران رہ گئے۔ اس حوض میں یہ خوبی تھی۔ کہ اس کی تہ تک ایک زینہ کے ذریعے جانا پڑتا تھا۔ اور وہ زینہ ایک ایسے حجرے یا کمرے میں جاکر ختم ہوتا تھا۔ جو حوض کی تہ کے نیچے واقع تھا۔ یہ حجرہ رقبہ میں ۳۶ مربع گز تھا اور سنگین حوض کی تہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس کی چھت پر ایک بلند منارہ اور حجرہ کے چاروں طرف چار پل تھے۔ حجرے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے لیکن پانی اندر نہیں جا سکتا تھا۔

اکبر عجائبات کا عاشق تھا۔ اس نے بنفسِ نفیس اس حوض کو ملاحظہ فرمایا کپڑے اوتار کر غوطہ لگایا اور حجرہ میں داخل ہوگیا۔ اس حجرہ میں ایک تکیہ اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے رکھی تھیں۔ حجرہ میں ہوا اور روشنی کا پورا انتظام تھا بادشاہ کو مختصر سی حاضری بھی دی گئی۔ جسے اُس نے نہایت شوق سے نوش فرمایا ہوا خواہ باہر تھے۔ وہ بہت گھبرائے۔ جب بادشاہ باہر آیا تو سب کو اطمینان ہوا بادشاہ نے اور خوش ہو کر حکیم موصوف کو منصب پنجصدی عطا کیا۔

جہانگیر نے بھی اس حوض کا اپنی تزک میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔
"حجرہ نہایت روشن ہے۔ جس کا راستہ اسی حوض میں سے ہے۔ مگر پانی کی ایک بوند اندر نہیں جاتی۔ دس بارہ آدمی حجرہ میں بآسانی بیٹھ سکتے ہیں" (ترجمہ)

جہانگیر نے حکیم علی گیلانی کو منصب دو ہزاری اور اس کے بیٹے حکیم عبدالوہاب کو پانصد سوار کا منصب عطا کیا۔ سنہ ۱۰۱۹ھ میں اسی نمونہ پر ایک اور حکیم نے فتحپور سیکری میں ایک حوض بنانا چاہا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔

اکبر کے زمانہ میں دریائے راوی نہایت جوش و خروش سے بہتا تھا۔ ان دنوں اس کا پانی اس قدر گہرا تھا۔ کہ اس میں جہاز چلا کرتے تھے (ترجمہ)

سنہ ۱۰۰۲ھ میں راوی کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الہی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ شہتیر سال اور ناجو کے استعمال کئے گئے۔ اور ۴۸۶۸ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس پر کام کرتے رہے۔ تیار ہو جانے پر ایک ہزار آدمیوں نے ۱۰ روز میں بڑی مشکل سے اسے دریا میں ڈالا۔ اور لاہری بندر (موجودہ روہڑی جو سکھر کے متصل دریائے سندھ پر واقع ہے) پہنچایا۔ جہاز وزنی تھا۔ اور دریا میں پانی کم تھا۔ اس لئے جہاز کو جابجا رکنا پڑا۔ آخر بعد مشکل جہاز منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اس زمانہ میں ایسے ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے۔ جو دریا کا زور بڑھا کر گذرگاہ کو جہازرانی کے قابل بنا لیتے۔ اس لئے آمد و رفت جاری نہ رہ سکی شہنشاہ نے سنہ ۱۰۰۴ھ میں ایک اور جہاز تیار کرایا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے وزن کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی یہ جہاز ۱۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک بآسانی جا پہنچا۔ اس کا مستول ۳۷ گز کا تھا اور ۸۳۳۴۹۱ روپیے اس پر لاگت آئی تھی[1]۔

زندہ دل بادشاہ نے جہاں جہاز چلا دئے وہاں کشتیوں کا کیا شمار ہوگا! اور پھر جب امراء و وزراء اور خود شہنشاہ کشتیوں کی سیر کرتے ہونگے اور عام لوگ بھی اپنی یا کرایہ کی کشتیوں میں دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے سیر ہوتے ہونگے۔ تو وہ وقت کیا فرحت افزا ہوتا ہوگا۔

سنہ ۹۹۹ھ کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھ (سندھ) پر یورش کی۔ سامانِ جنگ خشکی کے راستہ کے علاوہ راوی کے ذریعہ ٹھٹھ کو بھیجا گیا۔ دربارِ اکبری میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ بجائیں

[1] دربار اکبری۔ بحوالہ اکبر نامہ صفحہ ۱۱۲

ہزار ایک دفعہ۔ پھر لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ من غلہ سو بڑی توپیں اور دیگر سامان جنگ راوی کے ذریعہ ٹھٹھہ کو بھیجا۔ جہاں مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ سے کئی دن تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ خانخانان مرزا عبدالرحیم اس مہم کا سپہ سالار تھا۔ اور علاوہ دیگر کشتیوں کے کل ۲۵ جنگی کشتیاں لیکر لاہور سے وہ چلا تھا۔ اور سنہ ۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کر کے لاہور لے آیا۔"

اکبر کے زمانہ میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا۔ کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب و غریب طبیعت لیکر آیا تھا۔ جر ثقیل اور طبعیات کے عمل کرتا۔ علم ہیئت کے آلات رکھتا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھتا اور خود دکھاتا آگرہ کی طرح لاہور میں بھی آتشکدے تعمیر کرائے۔ نوروز کی صبح کو کھلے بندوں سورج کی پرستش کرتا۔ برہمن اپنے مذہبی تہواروں میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے۔ علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کراتا تھا۔

اکبر کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہو رہا تھا۔ جسے بیرون شہر کی آبادی (CIVIL STATION) کہتے تھے۔ شاہجہان کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور "شکار گاہ" بھی رہا ہے۔ ۹۹۷ھ کا ذکر ہے۔ کہ اکبر نے اپنے سوتیلے بھائی حکیم مرزا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد لاہور میں قیام کیا۔ اور ایران و توران کے بادشاہوں کے طریق پر "شکار قرغہ" یا جرگہ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر چالیس کوس کے دورے سے قراول اور شکاری جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے پانچ کوس پر شکار کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ اس زمانہ میں لاہور کے ارد گرد بے شمار جنگل تھے۔ جو ایک طرف

قصور۔ شرقپور اور شیخوپورہ اور دوسری طرف امرتسر تک پھیلے ہوئے تھے۔

عہدِ جہانگیری

اکبر کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لاہور جہانگیری عہد میں بھی ہندوستان کے کسی شہر سے کم نہیں رہا۔ ۱۶۲۶ء میں دو انگریزوں نے لاہور کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں :-

"لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعۂ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور ٹھٹھ کے لئے سوداگر لوگ جہازوں میں اپنا مال لاتے ہیں۔ اور دریا کے کنارہ پر ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا! اور کیا لوگ تھے! راوی اور جہاز! یہ دونوں باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں پھر خشکی کی تجارت اور بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹوں کی ہر سال ایران کو روانگی! کیا آج بھی جبکہ تہذیب و آسائش اپنی انتہائی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ یہ باتیں نظر آتی ہیں ؟

جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے ہی مہینے میں اہلِ لاہور کو ایک عجیب دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کی اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ باپ کی تخت نشینی کے بعد چار ماہ تک تو خسرو خاموش رہا۔ مگر پھر دفعتہً آگرہ کے قلعہ سے نکل بھاگا۔ اور دس ہزار سواروں کی معیت میں

دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آپہنچا۔ آتے ہی حکم دیا۔ کہ قلعہ کو فتح کر کے سات روز تک شہر کو بیدریغ لوٹو۔ بچہ۔ جوان۔ بوڑھا عورت جو ملے اُسے قتل کردو اور شہر کو آگ لگادو! فوج ایک دروازہ کو جلاکر شہر میں ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آپہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن راستہ میں سودھرہ (متصل وزیرآباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ جہانگیر اس وقت مرزا کامران کی بارہ دری میں جو راوی کے کنارہ پر واقع ہے۔ مقیم تھا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے جن میں حسن بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبدالرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں گڑوائیں۔ اور ان سات سو قیدیوں کو یکدم پھانسی دیدیا۔ خسرو کو پابہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا۔ اور جس راستے اُس کے سات سو ہمراہی سخت اذیتوں سے مارے جارہے تھے۔ اسی راستے اُسے قلعہ میں بھجوایا گیا۔ تاکہ وہ اپنے باغی ہمراہیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس کے سپہ سالار حسین بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبدالرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرادیا۔ اور یہ دونوں دم گھٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک قید رہا۔ آخر سنہ ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی میں مر گیا لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے!

اکبر یورپین پادریوں کی بیحد عزت کرتا تھا۔ لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لئے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر

کر دیئے۔ شاہجہان نے جو اکبر اور جہانگیر کی نسبت شریعت کا زیادہ پابند تھا تخت پر بیٹھتے ہی اِس گرجا کو مسمار کرا دیا۔ اور پادریوں کے وظائف ضبط کر لیئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۶۶۵ء میں) ایک فرانسیسی سیاح تھیونا ٹ لاہور آیا۔ اس وقت تک اس گرجا کے آثار باقی تھے لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور میں گرو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کا ایک قابلِ ذکر واقعہ گذرا۔ گرو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کی آپس میں عداوت تھی دیوان نے گرو کے خلاف گورنر لاہور کے کان بھرے اور کہا۔ کہ گرو کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو یوں آزاد رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ گرو ارجن دیو قید کر لیئے گئے۔ اور وہ قید ہی میں انتقال کر گئے۔ جب ان کا بیٹا گرو ہر گوبند جوان ہوا۔ تو اُس نے دیوان کے خلاف بادشاہ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ دیوان گرو ہر گوبند کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور ہر گوبند نے اسے قتل کر کے باپ کا انتقام لیا۔

جہانگیر نے قلعہ میں بہت سی عالیشان عمارتوں کا اضافہ کیا۔ اور اس کے امراء و وزراء نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں۔ اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔

جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال اُنس تھا۔ اور ۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دار السلطنت ہی بنا لیا۔ اور ۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفر کشمیر کے دوران میں راجوری کے قریب وفات پائی۔ تو لاہور ہی میں دفن کئے جانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اپنی چہیتی بیگم نورجہاں کے باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا عظیم الشان مقبرہ دریائے راوی کے دائیں کنارے پر قصبہ شاہدرہ کے پاس واقع ہے۔ اور عجائبات زمانہ میں شمار ہوتا ہے۔

عہدِ شاہجہانی

جہانگیر کے انتقال کے وقت نور جہاں کا داماد اور جہانگیر کا بیٹا شہریار لاہور ہی میں موجود تھا۔ اس نے سات دن میں سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے بیفکروں کی ایک فوج جمع کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ شاہجہان جو نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا داماد تھا اس وقت دکن میں تھا۔ وہ آصف جاہ کے اشارہ سے پر لگا کر آگرہ میں پہنچا۔ ادھر آصف جاہ یہ چال چلا کہ خسرو مرحوم کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو زندان خانہ سے نکال کر شہریار کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور سلطنت کی مبارکباد دی۔ داور بخش سمجھ گیا۔ کہ نور جہاں اپنے داماد اور آصفجاہ اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہیں۔ اور میں محض گوسفند قربانی ہوں اس نے آصف جاہ کا شکریہ ادا کر کے تخت و تاج سے انکار کر دیا۔ لیکن آصفجاہ نے اس قدر قسمیں کھائیں اور ایسا یقین دلایا۔ کہ وہ اجل گرفتہ شہزادہ آخر کار رضامند ہو گیا۔ وہ شہریار سے لڑا اور شہریار کو شکست ہو گئی۔ آصف جاہ اور داور بخش فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے۔ اور آصف جاہ نے شہریار کی آنکھیں نکلوا دیں اس موقعہ پر بد نصیب شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی

زرگس گلاب اے جہ نتواں کشید	کشید ند از نرگسِ من گلاب
اگر از نو پرسند تاریخ من	بگو کور شد دیدۂ آفتاب

شاہجہان نے آگرہ پہنچ کر آصف جاہ کو کہلوا بھیجا۔ کہ لاہور میں جسقدر شہزادے موجود ہیں۔ سب کو ٹھکانے لگا دو۔ چنانچہ ۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ بروز ہفتہ آصف جاہ نے داور بخش کو تخت سے اُتار کر قید کر دیا۔ اور شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا۔ داور بخش نے آصف جاہ کو اس کے قول و قسم یاد دلائے مگر وہاں

کون سُنتا تھا۔ آخر جمادی الاُولیٰ کو مندرجہ ذیل شہزادے ایک ہی وقت میں تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

(۱) شہزادہ داور بخش (۲) اس کا بھائی گرشاسپ (۳) شہریار۔ داماد نور جہاں (۴) طہورث اور (۵) طہماسپ (پسران سلطان دانیال پسر اکبر)

شاہجہان نے بادشاہ ہو کر اپنے باپ جہانگیر کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا (جسکا ذکر پہلے آچکا ہے) جو سالہا سال گذر جانے اور سکھوں کے زمانہ کی دستبرد کے بعد بھی ہندوستان کی لاجواب عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ نورجہاں نے بھی ۱۶۴۶ء میں اسی کے عہدِ حکومت میں وفات پائی۔ جس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں روضۂ جہانگیر کے نمونہ پر "چار چمن" کے اندر تعمیر کرایا تھا۔

آصف جاہ نے بھی جس کی کوششوں سے شاہجہان کو تختِ ہند نصیب ہوا۔ اسی کے عہد حکومت میں ۱۶۴۱ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کو آصف خاں یمین الدولہ" بھی کہتے ہیں۔ مآثر الامراء میں اس کے بہت سے حالات درج ہیں۔ بہت ہی بسیار خور تھا۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ "ایک من شاہجہانی خوراک دن رات میں کھاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ اور اس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار میں میاں سلطان کی سرائے اور اس کا ٹھنڈا کنواں اور باغ موجود ہے۔ آصف جاہ کی عالیشان حویلی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ عہد عالمگیری کے مؤرخ منشی سجان رائے بٹالوی نے اس حویلی کے متعلق لکھا ہے :-

"از عمارات منازل بادشاہزادگاں و امرائے والاشان خصوص عمارت

(صفحہ ۶۵)

آصف خاں عرف امیر الحسن بن اعتماد الدولہ۔ از دیاد آبادی گردید (خلاصۃ التواریخ
مآثر الامراء اور ظفر نامہ شاہجہان میں لکھا ہے۔ کہ اس حویلی پر بیس ۲۰ لاکھ
روپیہ لاگت آئی تھی! حویلی کیا تھی۔ ایک خاصا قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ[1] کے عقب
سے لے کر شہید گنج۔ سرائے میاں سلطان اور ریلوے ٹیکنیکل سکول تک پھیلی
ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام مسجدیں۔ دفاتر۔ تالاب۔ حوض۔ فوارے۔ باغ
اور زنانہ مردانہ محلات تھے۔ شاہجہان اس میں کئی مرتبہ آیا تھا۔ دہلی۔ آگرہ
اور کشمیر میں آصف جاہ کی جائداد کا جائزہ لیا گیا۔ تو اڑھائی کروڑ روپیہ تک
درج رجسٹر ہوا۔ بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد ۲۰ لاکھ روپیہ اس کے
تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور حویلی شہزادہ داراشکوہ کو
مرحمت فرمائی۔ باقی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کی گئی ؎

جہانگیر نے قلعہ لاہور میں کچھ عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن شاہجہان کو پسند نہ
نہ آئیں۔ اس لئے نواب وزیر خاں بانیٔ "مسجد وزیر خاں" کو حکم ہوا۔ کہ سب عمارات
از سر نو تعمیر کرائی جائیں۔ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان پھر آگرہ سے لاہور میں آیا۔
علی مردان خاں قندہاری بادشاہ کے حضور میں آیا۔ شاہجہان نے اسے پانچ لاکھ
روپیہ نقد اور ایک خلعت فاخرہ انعام دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ علامی
افضل وزیر سلطنت تھے ؎

شاہجہان ۱۶۳۹ء میں پھر لاہور آیا۔ علی مردان خاں اور داراشکوہ پیشوائی
کے لئے موجود تھے۔ علی مردان خاں نے اہل ایران کے طور و طریق پر شب برات
کی روشنی کا تماشا بادشاہ کو دکھایا۔ مختلف شکلوں کے تختوں اور چھتوں پر
طاق بندی کی۔ اہل لاہور نے اس قسم کی کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسی
شب بادشاہ نے دس ہزار روپیہ غرباء میں تقسیم کیا۔ اور اسی رات علامہ عبد الحکیم

[1] مولوی محمد انشاء اللہ خاں، آنریری مجسٹریٹ درجۂ اول و ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے مکان کا نام ہے ؎

سیالکوٹی اور ملا فاضل کو چار چار سو اشرفی انعام میں دی گئیں۔[1]

لاہور میں شاہجہان کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے۔ جو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔

شاہجہان کے عہد حکومت میں بھی کئی فرنگستانی سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں لاہور کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

(ترجمہ) "آگرہ سے روانہ ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا۔ کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا۔ جس میں آبادی اس قدر تھی۔ کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد موجود نہیں ہیں۔ مؤلف) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ پیادہ چل رہے تھے۔ کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں غرض کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس لئے ہم واپس آ گئے۔ شہر کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے۔ جہاں نانبائی اور مختلف دوکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر ہم نے بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ۔ بکری گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا۔ البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دوکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو

---

[1] تاریخ محمد شاہی قلمی مصنفہ خوشحال چند سامی۔

لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہے۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں۔ فوق) ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے۔ جو میدہ سے بنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلےٰ سے اعلےٰ قسم کا کھانا دو وقتوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط اور ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بحد متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے بلکہ در و دیوار سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے۔ جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے۔ اور وہاں سے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجے کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغات۔ محلات۔ تالاب اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بڑے بازار کا نام بازار دلکشا[1] ہے۔ اس میں اس قدر دولت ہے۔ کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور کو ہوئی۔ وہ اکبر کے زمانہ سے بھی زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دُور دُور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے۔ اور باغات و محلات کی کثرت نے لاہور کو گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ نواب علیم الدین الملقب بہ وزیر خاں نے اپنی عالیشان مسجد شہر کے اندر بنائی جو اب تک لاہور کی زینت کا باعث ہے نواب وزیر خاں کا باغ۔ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کا فلک نما مکان جو آج

---

[1] "بازار دلکشا" معلوم نہیں کس جگہ واقع تھا۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خوب کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہوگا۔

"رنگ محل" میں "حویلی میاں خاں" کے نام سے موسوم ہے۔ نواب وزیر خاں کا مکان "پری محل" جس کے کھنڈرات اب بھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نظر آتے ہیں دائی لاڈو کے آسمان مرتبت ایوانات جو باغ مہاں سنگھ اور باغ رتن چند "ڈاڑھی والا" کے پاس پاس تھے۔ اور جہاں اب بھی دائی لاڈو کی مسجد موجود ہے۔ پھر محلہ "دائی انگہ" جو ریلوے سٹیشن کے پاس تھا۔ اور جہاں اب بھی مسجد دائی انگہ موجود ہے۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں جنہیں محکمہ ریلوے نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے بیسیوں محلے لاہور کی زیبائش و شہرت کا باعث تھے۔

یہ شرف لاہور ہی کو حاصل ہے۔ کہ نواب سعد اللہ خاں (وزیر شاہجہان) نے اپنی ابتدائی زندگی حصول علم میں اسی جگہ گذاری۔ اور پھر جب بادشاہ کو اس کی قابلیت کا علم ہوا۔ تو لاہور میں اسے شرف باریابی بخشا۔ اور چار ہی سال کے اندر اس کو تمام ہندوستان کا مدار المہام بنا دیا۔ اور پھر جب سعد اللہ خاں نے وفات پائی۔ تو اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کو اعلیٰ منصب عطا کیا اور اس کے دوسرے بیٹوں اور متوسلین کے روزینے مقرر کر دیئے۔

دارا شکوہ چونکہ صوفی منش شہزادہ اور سلطنت کا ولیعہد تھا۔ اسلئے پنجاب کے لوگ اور خصوصاً اہالیان لاہور اس کے نہایت گرویدہ تھے۔ شہزادہ بھی ان سے بہت مانوس تھا۔ اس نے کئی عالیشان محلات تعمیر کرائے۔ اور ایک پرفضا چوک اپنے نام سے اس جگہ قائم کیا جہاں لنڈا بازار ہے۔ آج کل مسجد شہید گنج واقع ہے۔ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ جس کی ایک کچی پکی دیوار ریلوے ٹیکنیکل سکول کی تعمیر کے زمانہ میں مسمار کر دی گئی تھی۔

دارا شکوہ کے دم سے لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح ۱۵ اسلامی

تصوف کا دلدادہ تھا۔ اسی ذوق شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا مجلس میں ایک طرف صوفیاء بیٹھے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ اکبر کی طرح مسلمان علماء اور ہندو پنڈتوں کے مباحثے کراتا۔ اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کراتا تھا۔

داراشکوہ اور گورو ہرگوبند میں بہت موانست تھی۔ جب گوروجی امرتسر سے آتے۔ تو مہینوں داراشکوہ کے مہمان رہتے۔ اور مسائل تصوف کے ذکر اذکار سے صحبت گرم رکھتے۔

عہدِ عالمگیری

اگرچہ باپ کو نظر بند کر کے عالمگیر (اورنگ زیب) ۱۶۵۸ء میں بادشاہ ہوگیا تھا۔ لیکن جب تک بھائی موجود تھے۔ خصوصاً داراشکوہ جو ولیعہد تھا۔ اس وقت تک اسے اطمینان نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے پنجاب کا رخ کیا جو داراشکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ داراشکوہ جہاں کہیں بھی ہوگا بھاگ کر آخر لاہور ہی میں جائیگا اور وہاں سے تیار ہو کر مقابلہ کو نکلیگا۔ چنانچہ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ داراشکوہ بھاگ کر پہلے شالامار باغ میں پہنچا۔ اور وہاں سے زمین دوز سرنگ کے ذریعے قلعہ میں پہنچا اور اپنا خزانہ جو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا تھا ہمراہ لے کر ملتان کے رستے بھکر اور سندھ کو چلا گیا۔ تقریباً چودہ ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اور توپخانہ اور کارخانجات شاہی یہ سب اس کے علاوہ تھے۔ بڑی بڑی کشتیوں میں یہ سب اسباب لدوا کر راوی میں ڈالا۔ اور وہاں سے ملتان پہنچا۔ اس کے جانیکے بعد شہزادہ اعظم شاہ (اورنگ زیب کا بیٹا)

ایک زبردست فوج لیکر لاہور پہنچا۔ مگر خیریت گذری کہ لاہور والوں کو کوئی تکلیف نہ دیگئی۔ اِس سے چند ماہ بعد اورنگ زیب بھی لاہور پہنچا۔ اور شالامار باغ کے پہلے تختے میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ قلعہ کی سیر کی۔ اور واپسی پر مسجد وزیر خاں میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باغ میں چلا گیا۔ مہمات پنجاب کا کام شہزادہ اعظم اور قلعہ دار اور خلیل اللہ خاں گورنر لاہور کو سپرد کر کے خود شجاع کے استیصال کے لئے واپس چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور میں آیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گذر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔

لاہور میں عہدِ عالمگیر کی تین یادگاریں ہیں۔ جن میں سے دو تو مٹ گئی ہیں لیکن ایک موجود ہے۔ اور انشاء اللہ تا قیامت موجود رہیگی۔ ان یادگاروں کا تھوڑا تھوڑا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سنہ ۱۶۶۳ء میں عالمگیر لاہور میں تھا۔ کہ اس کے قابل اور دانا وزیر خلیل خان نے ۲۷ ذیقعدہ کو ستر سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ اس نے اپنا عالیشان مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تیار کرا لیا تھا۔ بادشاہ کے حکم سے وہیں دفن کیا گیا۔ بادشاہ اس موقعہ پر کوئی جشن کرنے کو تھا۔ لیکن وزیر کی موت پر اس نے وہ جشن ملتوی کر دیا۔ خدا جانے کس قدر عظیم الشان مقبرہ تھا۔ مگر اب معلوم بھی نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا۔

دوسری یادگار ایک بند تھا۔ جو عالمگیر نے سنہ ۱۶۶۱ء میں لاہور کو راوی کی دستبرد سے بچا لینے کے لئے باندھا تھا۔ اس بند کا ذکر لاہور کی اردو انگریزی

تاریخوں میں کہیں کہیں نظر سے گذرتا ہے۔ لیکن خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سبحان رائے بٹالوی میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"در عہد حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی چوں دریائے راوی بجانب شہر رُو نہاد۔ واز صدمات آں بہ اکثر عمارات و باغات آسیب رسید درسنہ چہارم جلوس والا برائے تعمیر بند مستحکم کہ سدِ انہدام عمارات تواند بود حکم مقدس بصدور پیوست۔ فرمان پذیراں بند بہ درازئے دو کروہ بہ استحکام تمام بستند۔ و بہ محافظت شہر سدِ عالمگیری بسان سدِ سکندری بروئے کار آوردند۔ و در اکثر جا مانند تالاب زینہ آراستہ لبِ دریا را بہ مثال لبِ خوبان دلفریب ساختند۔ و خوانین والا نشان نشیمن ہائے دلکشا، منازل فرح افزا مشرف بہ دریا احداث نمودہ زینت افزائے شہر شدند۔ واز ابتدائے سال چہارم نہایت حال کہ زیادہ از چہل بے گذرد۔ و در ہر سال ترمیم و تعمیر از سرکار بادشاہی میشود و برائے بندوبست مبلغ کلیہ بہ خرچ مے رود"۔

اس روح افزا کیفیت کو ذرا ذہن میں لایئے۔ جبکہ بندِ عالمگیری مکمل ہو چکا تھا۔ اور اس کے کناروں پر تالاب کی سیڑھیوں کی طرح نہانے اور سیر و تفریح کے لئے سیڑھیاں موجود تھیں۔ اور امرائے والا نشان نے وہاں خوشنما بنگلے دلفریب مناظر کی سیر کے لئے تعمیر کئے تھے۔ اُس زمانہ میں دریا کے کنارے پر کیا کچھ رونق نہ ہوگی!۔ مگر آہ۔ آج وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں!

اس بند کے کچھ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں راقم الحروف کے اخبار "پنجہ فولاد"[۱] کا دفتر لنڈا بازار لاہور کے جھنگڑ محلہ میں تھا۔ وہاں ایک شخص نے اپنا مکان بنانے کے لئے جب بنیادیں کھودیں تو اندر سے ایک

---

[۱] آجکل جناب فوق اخبار کشمیری کے مالک و مدیر ہیں (گیلانی)

طویل پختہ دیوار نکلی - جو مسجد شہید گنج کی طرف سے آتی تھی - اور علاقہ محلہ "نولکھا" کی طرف جاتی تھی - مالکِ مکان نے اِس دیوار میں سے اس قدر اینٹیں نکالیں - کہ اسے نئی اینٹیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہی - مصری شاہ اور "چاہ میراں" کے درمیان اب بھی اس بند کے آثار سے ملتے ہیں - ان کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ بند ریلوے سٹیشن اور لنڈا بازار کے درمیان سے چاہ میراں کی طرف جو اُس زمانہ میں دریا بُرد زمین تھی - نکل جاتا تھا - خلاصۃ التواریخ کا مؤلف اس بند کا طول دو کوس بتاتا ہے -

عالمگیر کی تعمیری یادگار لاہور کی "شاہی مسجد" ہے - جو لاہور کی زینت کا باعث ہے - اس مسجد کا پتھر دراصل دارا شکوہ نے اس غرض سے ہندوستان سے منگوایا تھا - کہ چوک دارا شکوہ سے لیکر "حضرت میاں میرؒ" کے مزار تک ایک پختہ سڑک بنوائے - اور حضرت کا روضہ تعمیر کرائے جو صدہا سال تک یادگار رہے لیکن اسکی یہ آرزو بر نہ آئی اور وہ قتل کر دیا گیا - عالمگیر نے تمام سنگِ سرخ ضبط کر کے لاہور میں جامع مسجد تعمیر کرا دی - اور خدامِ میاں میر صاحبؒ کی معروضات پر حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جو آج تک قائم ہے - آجکل دریا راوی

لہ "چاہِ میراں" جو عام طور پر "میراں دی کھوہی" کے نام سے مشہور ہے - اسی علاقہ میں واقع ہے جہاں پہلے دریا بہتا تھا - بند عالمگیری کیوجہ سے جب دریا یہاں سے ہٹ گیا - تو یہ جگہ خشک ہو گئی - اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بَن ہو گیا - جس میں اکثر درندے رہتے تھے - اور بچادہ (جنگلی لوگ) لاہور اور مضافات پر ڈاکہ زنی کر کے اسی بَن میں چھپ جاتے تھے - لہنا سنگھ حاکم لاہور نے سمت ۱۸۵۰ بکرمی میں یہاں ایک بستی قائم کی اور اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کی - سب سے پہلے ایک میر صاحب نے یہاں ایک کھوہی (چاہ خورد) تعمیر کی - انہی کے نام پر موضع کا نام "میراں دی کھوہی" یعنی چاہ میراں مشہور ہو گیا - سکھوں کے زمانہ میں یہاں بہت سی باغات لگائے گئے - حضرت شاہ حسین زنجانی کا مزار بھی اسی جگہ ہے *

اس مسجد سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں بہتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بادشاہی مسجد اور قلعہ کے بالکل متصل بہتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے:۔

"اگرچہ در شہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است۔ اما بر کنارۂ دریا محاذی دولت خانۂ والا حضرت عالمگیر بادشاہ مسجد عالی از سنگ بنا فرمودہ اند کہ زیادہ از پنج لک روپیہ بر آں صرف شدہ"

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کا ایک نامور شاعر ابوالبرکات منیر کے نام سے گذرا ہے۔ جب عالمگیر کو اشرفی اور روپیہ کے لئے شعروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو ہندوستان کے بڑے بڑے نامی شعراء نے ابیات لکھے۔ انہی میں لاہور کا منیر بھی تھا۔ اس نے اشرفی کے لئے ذیل کا شعر کہا:۔

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور روپیہ کیلئے یہ شعر:۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

منیر نے انعام کی خواہش ظاہر کی۔ مگر بادشاہ نے جواب دیا۔ کہ یہ کیا کم بات ہے کہ تمہارا نام میرے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیگا!

ایک مشہور فرانسیسی جوہری نے ۱۶۴۱ء سے ۱۶۶۸ء کے درمیان اصفہان سے لیکر لاہور دہلی اور آگرہ تک پاپیادہ سفر کیا ہے۔ وہ عالمگیر کے عہد حکومت کے اختتام پر لاہور آیا۔ جس کے متعلق وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

(ترجمہ) "لاہور سلطنت کا دار الخلافہ ہے۔ جو پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک کے کنارے واقع ہے۔ دریا پہلے شہر کے متصل بہتا تھا۔ مگر اب پون میل کے فاصلہ پر چلا گیا ہے۔ اور اپنی طغیانی سے گرد و نواح کے علاقوں کو بہت نقصان پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے۔ اس کی لمبائی ایک کوس سے زیادہ ہے۔ اسکی عالیشان

عمارتیں جو آگرہ اور دہلی کی عمارتوں سے بھی زیادہ بلند ہیں عدم توجہی کی وجہ سے گرتی جاتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں بہت سے مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ قلعہ جس میں تخت گاہ شاہی ہے۔ بہت اچھی حالت میں ہے۔ اور چونکہ دریا اب اس سے بہت فاصلے پر ہے اس لئے وہ بالکل محفوظ ہے"۔

ڈاکٹر برنیئر جو عالمگیر کے عہد میں ۱۶۶۴ء میں لاہور آیا تھا لاہور کے متعلق لکھتا ہے :-

(ترجمہ) "یہ ایک نفیس شہر ہے۔ اس کے بازار اور منڈیاں بہت بارونق ہیں۔ ہر جگہ نے غم دزد۔ نے غم کالا کا عالم ہے۔ مکانات اپنی پختگی۔ خوبصورتی۔ بلندی اور شان و شوکت کے لحاظ سے آگرہ اور دہلی کی شاہی عمارات سے کم نہیں"۔

عالمگیر کی بیٹی زیب النساء بیگم نے جو قرآن شریف کی حافظہ اور نہایت عالمہ و فاضلہ شہزادی تھی۔ لاہور میں ایک عالیشان باغ تعمیر کرا دیا۔ جواب تک "چوبرجی" کے نام سے راجہ پونچھ کی موجودہ کوٹھی کے متصل "نواں کوٹ"[1] کی طرف موجود ہے۔ بیگم نے اپنا مقبرہ بھی لاہور ہی میں اس باغ کے متصل تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کے گرد عظیم الشان چار دیواری کے اندر ایک اور وسیع باغ لگوایا تھا۔ لیکن دہلی کے خمیر نے شاہزادی کو لاہور میں دفن نہ ہونے دیا! سکھوں کے زمانہ میں اس چار دیواری کے اندر "شہر محکم" نے ایک موضع "نواں کوٹ" کے نام سے آباد کیا۔ جواب تک موجود ہے۔

---

[1] اس موضع میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے تین چار سال سے ایک اسلامیہ ہائی سکول جاری ہے۔ پنڈت جنارد ھن کا رام باغ جس کو نیا شالا باغ بھی کہتے ہیں اسی موضع کے متصل ہے۔

بارہ دری میرزا کامران

یہ حسرتناک عمارت ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کی سب سے پہلی یادگار ہے۔ اس سے بہتر اعلیٰ اور عظیم پیمانہ پر اس سے قبل کسی مغل عمارت کا تاریخ سے پتہ نہیں ملتا۔ تاریخ کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔ ہمایوں کے تین بھائی اور تھے۔ میرزا ہندال۔ میرزا عسکری اور میرزا کامران۔ ان میں آخر الذکر پنجاب کا حکمران تھا۔ اور دارالحکومت لاہور میں رہتا تھا۔

مرزا کامران نے ۹۳۷ھ سے ۹۴۷ھ کے درمیان اپنی شاہانہ رہائش اور شاہانہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے راوی سے پار قریباً دو میل کے فاصلہ پر شاہدرہ کی جانب ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا جس کے عین مرکز میں فن عمارت کی یہ بےنظیر یادگار یعنی بارہ دری تعمیر کرائی۔

کہنے کو یہ عمارت صرف ایک بارہ دری تھی۔ مگر اس کے ساتھ اور بھی بہت سے شاہانہ طرز کے مکانات تھے۔ زنانہ محلات۔ دیوان عام۔ دیوان خاص مسجد یہ سب چیزیں اس نادرہ روزگار باغ کے اندر واقع تھیں جن کا آج نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔

اس زمانہ میں دریا لاہور کی دیواروں سے ٹکرا کر بہتا تھا۔ اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ طغیانی و سیلاب کے دنوں میں اس کی تند و تیز اور نہ رکنے والی لہریں شہر کے اندر بھی آ جاتی تھیں۔ اور اکثر مکانات کو منہدم اور کئی لوگوں کو بے خانماں کر جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اکثر عالیشان عمارتیں اور باغات دریا سے پار اور شہر سے فاصلہ پر تعمیر کئے جاتے تھے۔ تاریخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہان مغل اور امرائے چغتائیہ نے شاہدرہ کے علاقہ

میں بہت سے باغات و مکانات تعمیر کرائے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے جس میں ایک خاص فرقہ کو بوجہ تعصب آج کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ جب دیکھا۔ کہ راوی کی لہریں اہل لاہور کو بیتاب و بے چین کر رہی ہیں۔ اور جو عمارتیں اور باغات شہر کے نزدیک ہیں۔ وہ دریا برد ہوتے جاتے ہیں۔ تو چہارم سال جلوس میں بند عالمگیری[1] تعمیر کرا کر دریا کا رُخ شہر سے ہٹا دیا۔ جس سے اہل لاہور آنے والی مصیبتوں سے بچ گئے۔

یہ عالیشان عمارت پختہ مصالحہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے جنوب کیطرف ۱۹۰۵ء[2] تک ایک محرابدار پل کا ایک حصہ باقی تھا۔ اور باغ کی روشوں کی اور بعض دیواروں کی بنیادیں تو اب تک موجود ہیں۔ محمد شاہ کے زمانہ میں اس عمارت کو سب سے پہلا صدمہ پہنچا۔ اس زمانہ میں دریا جو پہلے قلعہ اور بادشاہی مسجد کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا تھا۔ اب بارہ دری کی دیواروں کی پا بوسی کر رہا تھا۔ جس کا نتیجہ آخر میں "سیل افگند دیوار را" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بند عالمگیری نے شہر کو تو بچا لیا۔ مگر جس قدر عالیشان عمارتیں اور بے نظیر باغات دریا سے پار رہتے۔ وہ دریا کا رُخ بدل جانے کیوجہ سے سب ملیا میٹ ہو گئے۔ اور اُنہی میں مرزا کامران کا باغ بھی تھا۔ جس کے متعلق ٹھاکر تھیج[3] صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ باغ مع محل علاقہ لونکھا سے راوی تک پھیلا ہوا تھا حوض اور فوارے بلکہ سوائے بارہ دری کے باغ کی دیگر عمارتیں سب نیست و نابود ہو گئیں۔ بارہ دری کی تمام عمارت قالبوتی ہے۔ لکڑی کا کہیں نام بھی

---

[1] خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی۔ سال تصنیف ۱۱۰۷ھ صفحہ ۶۵ [2] بند عالمگیری کے حالات انشاءاللہ علیحدہ تحریر کئے جائینگے۔

[3] ملاحظہ ہو اخبار رفیق ہند مطبوعہ ۱۸۹۴ء

ہیں۔ محرابوں کے نیچے مختلف رنگوں میں جو نقش و نگار تھے ۔ ۱۸۹۴ء تک
اُن کے کچھ آثار قائم تھے ۔ مگر نیرنگیٔ عالم سے اب وہ بھی مٹا دیئے ہیں
بارہ دری کی عمارت جو مرزا کامران کی نشستگاہ تھی ۔ ایسی مضبوط اور
مستحکم بلکہ سخت جان ہے کہ ہرچند محمد شاہ کے زمانہ سے جس کو آج ۱۳۴۱ء
ہیں ۲۰۰ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ گذر چکا ہے ۔ راوی کی طوفان خیز موجیں اس
کی تباہی کے درپے ہیں ۔ لیکن آج تک سوائے ایک حصہ کے جس کو موجودہ
نسل نہیں جانتی کہ کب منہدم ہوا ہے اور کسی حصہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا
قریبا چارسو سال سے یہ عمارت بدستور کھڑی ہے ۔ اور دریا کے ریلوے پل
اور دوسرے پل سے جو سر لوئیس ڈین کے عہد حکومت میں گاڑیوں اور پاپیادہ
چلنے والوں کے لئے بنایا گیا ہے ۔ صاف نظر آتی ہے ۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے
جس میں سیاح دیگر قدیم عمارتوں کی طرح اس کی دیواروں ، چھتوں اور سیڑھیوں
پر مختلف اشعار اور عبارتیں لکھ جاتے ہیں ۔

۹۴۷ھ میں جب شیر خاں سوری کا اقبال ہمایوں کے عروج و اقتدار شاہی
پر غالب آ رہا تھا ۔ اور ہمایوں بھاگتا پھرتا تھا ۔ تو اسی عالیشان بارہ دری میں
ہمایوں اور اس کے تینوں بھائی اور دیگر امراء ایک آخری اور قطعی فیصلہ کے لئے
جمع ہوئے ۔ بھائیوں نے ہمایوں کا ساتھ دینے اور شیر خاں کا مقابلہ کرنے
کے لئے اسی باغ اور اسی بارہ دری میں باہم عہد و پیمان کئے ۔ مگر دل چونکہ صاف
نہ تھے ۔ خصوصاً کامران مرزا شیر خاں کو بھی اپنی حکومت پنجاب کی بحالی کے لئے
خوش رکھنا چاہتا تھا ۔ اس لئے آخر کار شیر خاں سب پر کامیاب ہو گیا ۔ چنانچہ
شیر خاں نے شیر شاہ ہو کر جب اپنا ایلچی مرزا کے پاس بھیجا ۔ تو مرزا نے اسی

۱؎ تخت نشینی ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ ۔ وفات ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ

باغ میں اس کو اُتارا اور ایک بڑا جشن کیا - جس میں تمام امراء - غربا بلا تمیز مذہب و ملت مدعو کئے گئے۔

معلوم ہوتا ہے - جہانگیری جلوس کے سال اول (سنہ ۱۰۱۴ھ) میں باغ اور بارہ دری اور محلات کامران اپنی رونق و زیبائش میں تھے۔ کیونکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد (سنہ ۱۰۱۵ھ صفر) میں جہانگیر جب اپنے باغی بیٹے سلطان خسرو کی گوشمالی کے لئے آگرہ سے لاہور آتا ہے - تو مرزا کامران ہی کے باغ میں فروکش ہوتا ہے - اس عبرت انگیز واقعہ کی کچھ کیفیت مآثر الامراء اور پنجاب کی تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد یہاں لکھتا ہوں۔

سلطان خسرو جہانگیر کا بیٹا اکبر کا لاڈلا پوتا اور راجہ مان سنگھ کا عزیز بھانجہ تھا - وہ ۲۰ - ذی الحجہ سنہ ۱۰۱۴ھ کو قلعہ آگرہ سے نکل کر لوٹ مار کرتا پنجاب آیا - حسن خاں بدخشی رہتاس کا جاگیردار اور عبدالرحیم لاہور کا دیوان تھا ان دونوں کے ایما سے وہ اس مطلب کے لئے کابل کو روانہ ہوا - کہ وہاں سے فوج لائے اور باپ کا مقابلہ کرے - اُس زمانہ میں دریائے چناب جو آج وزیرآباد سے بھی ایک میل کے فاصلہ پر دُور ہے سوہدرہ کے متصل بہتا تھا اور سوہدرہ میں دریا کا ایک مشہور گھاٹ تھا جب یہاں سلطان خسرو کی کشتی پہونچی - تو ایک مقام پر ریت میں ایسی پھنس گئی کہ باوجود کوشش کے نکل نہ سکی - خسرو آخر گرفتار ہو گیا - اور گرفتار ہو کر حسن بیگ اور عبدالرحیم کے ہمراہ چنگیز خانی دستور کے موافق پابہ زنجیر ۳ صفر سنہ ۱۰۱۵ھ کو شہنشاہِ جہانگیر کے روبرو باغ مرزا کامران میں حاضر کیا گیا۔

شہنشاہ بیٹے کی تنبیہہ و تادیب کے لئے اسی باغ اور بارہ دری میں کئی دن تک مقیم رہا - سب لاؤ لشکر اس کے ساتھ تھا - یہاں تک محلات اور

ان کے تمام لوازمات بھی اور یہ تمام مختصر سی دنیا اسی باغ کے ارکانات میں سمائی ہوئی تھی۔ شہنشاہ نے حکم دیا۔ خسرو کو باغ میں نظر بند رکھا جائے۔ اور حسن بیگ کو پوست گاؤ اور عبدالرحیم کو پوست خر میں زندہ بند کردو۔ چنانچہ حسن بیگ تو اسی روز مرگیا اور عبدالرحیم نے دوسرے دن تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

جب شہنشاہ باغ اور بارہ دری کی اقامت ترک کرکے قلعہ میں داخل ہوا جس کی دیواروں کے ساتھ اُس زمانہ میں دریا بہتا تھا۔ تو خسرو کو بھی اسی طرح پابہ زنجیر قلعہ میں لایا گیا۔ اور کس عبرت انگیز اور دردناک طریقہ سے؟ ذرا ملاحظہ ہو شہنشاہ نے حکمدیا۔ کہ باغ مرزا کامران کے دروازہ سے لیکر قلعہ کے دروازہ تک دورویہ پھانسیاں نصب کی جائیں۔ اور خسرو کے تمام ساتھی ان پر مصلوب کیئے جائیں۔ دوسرے دن خسرو کو برہنہ پشت ہاتھی پر بٹھا کر حکمدیا۔ کہ ان پھانسیوں کے درمیان سے وہ گذرے۔ اور اس سے پوچھا جائے۔ کہ تمہارے خوشامدی اور اہل خدمات تم کو کس طرح سلام کرتے تھے۔

شہزادہ داراشکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیا میں حضرت میاںمیر رح کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ حضرت میاں جیو صاحب (داراشکوہ حضرت میاںمیر کو اسی طرح خطاب کرتا ہے) مرزا کامران کے باغ کے اندر اس عمارت میں جو حوض کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اور اب وہ مکان پانی کے نیچے دب گیا ہے بعض اوقات چند خاص خدام کے ہمراہ دن کو فروکش ہوتے اور آرام فرماتے۔

ف تاریخ لاہور مج محمد لطیف میں لکھا ہے۔ کہ ان کی تعداد سات سو تھی۔ جہانگیر نے ان کو بڑی بڑی تکلیفیں دیکر مروایا۔ جہانگیر خود تزک میں لکھتا ہے۔ میں نے عبرت وسیاست کے لیئے ان سب کی زندہ کھالیں کھچوائیں۔

اسی کتاب میں ایک اور جگہ داراشکوہ حضرت میاںمیر کے قیام باغ کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے - ایک دن حضرت میاں جیو مرزا کامران کے باغ میں لیٹے ہوئے تھے - ایک بہت بڑا سیاہ سانپ نکلا ۔ شیخ عبدالواحد بنسانی نے جو کہ ۲۱ سال سے متواتر حاضر باش اور خدمت گزار تھے - عرض کیا - حضرت ایک بہت بڑا سانپ آپ کی طرف آرہا ہے - فرمایا آنے دو - جب وہ نزدیک آیا - تو اُٹھ کر بیٹھ گئے - سانپ بھی رُک گیا - اور کچھ آواز سی نکالنے لگا - حضرت نے فرمایا - بہتر اسی طرح سہی - چنانچہ وہ سانپ حضرت کے گرد تین مرتبہ پھرا اور چلا گیا - بنسانی کہتے ہیں - مَیں نے عرض کیا یا حضرت یہ کیا معاملہ تھا - فرمایا سانپ کہتا تھا - میں نے دل میں یہ عہد کیا تھا - کہ جب آپ کو دیکھوں گا - تو تین بار آپ کے گرد پھرونگا - مَیں نے کہا - بہتر اسی طرح سہی - چنانچہ وہ اپنا کام کر کے چلا گیا ہے - بہر حال داراشکوہ کی تحریر سے کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے - کہ اس باغ میں ایک اتنا بڑا حوض بھی تھا - جس میں رہائش کے قابل ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی - اس تحریر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے - کہ داراشکوہ کے زمانہ اور شاہجہان کے عہد ہی میں یہ باغ اور بارہ دری کس مپرسی کی حالت تھے - اگر ایسا نہ ہوتا تو حوض تہ آب نہ ہو جاتا -

ہمایوں جب ۹۶۰ھ میں آئین جہاں کے تمام نشیب و فراز دیکھ کر ایران سے واپس آیا - اور جب کامران نے کابل میں اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی - تو ہمایوں کے حکم سے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی - آخر اسی نابینائی کی حالت میں اپنی سندھی بیگم کے ساتھ وہ حج کو چلا گیا جہاں ۱۱ ذالحجہ ۹۶۴ھ کو انتقال کر گیا *

دریائے راوی پر باغ و بارہ دری مرزا کامران کے سامنے سالہا سال تک

کشتیوں کا پُل رہا ہے۔ اسی زمانہ میں اس بارہ دری میں محکمہ نہر کے کوئی صاحب بہادر رہتے تھے۔ جب سے کشتیوں کا پُل توڑ دیا گیا ہے۔ اور جدید پُل تیار ہوا ہے بارہ دری بالکل خالی ہے۔ اور لوگوں کی سیر و تفریح کے کام آتی ہے۔ چمن بندیاں اور روشیں اب بھی موجود ہیں۔ اتوار کو شوقین لوگ آتے ہیں۔ اور بارہ دری میں بیٹھ کر دریا کی دلفریب روانی اور کشتیوں کی پُرکیف دوڑ کے دلچسپ نظارے سے حظ وافر اُٹھاتے ہیں ۔

قلیچ خاں اندجانی گورنر لاہور

داراشکوہ کی رُوح پُرفتوح پر پھولوں کی بارش کرنی چاہیئے۔ کہ وہ اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں کہیں کہیں لاہور کے بعض پُرانے محلوں۔ باغوں اور مکانوں کا بھی سرسری طور سے ذکر کر گیا ہے۔
میں کہ بزرگوں کی ہڈیوں کی حفاظت اور ان کے کارناموں کی اشاعت کو ذریعہ نجات اُخروی اور عمارات قدیمہ (موجود و معدوم) کی سیر اور ان کے ذکر کو ذریعہ عبرت و بصیرت تصور کرتا ہوں۔ ان ٹکڑوں کو جس دسترخوان سے ملتے ہیں۔ کاغذی کچکول میں جمع کرکے پھر اس انداز سے سجانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہ وہ اہل دل اصحاب کی رُوح کو غذائے تازہ کا کام دے سکیں ۔ سکینۃ الاولیاء میں بعض ایسے پُرانے محلات و باغات اور مکانات کا ذکر ہے۔ جو داراشکوہ کے زمانہ میں لاہور کی زیب و زینت تھے۔ مگر آج جن کا کوئی مٹا ہوا نشان بھی باقی نہیں ہے جس سے ہم یہ اندازہ ہی لگا سکیں کہ وہ فلک نما عمارتیں جنہوں نے لاہور کو عروس البلاد بنا رکھا تھا کہاں واقع

تھیں وہ عالیشان باغات جو اپنی تر و تازگی اور کثرت اثمار و اشجار کے لحاظ سے رشک صد کشمیر اور تختہ گلزار جنت تھے۔ کس جگہ احداث تھے ٭

انہی باغات میں جن کا آج لوگ نام بھی نہیں جانتے۔ ایک باغ نواب قلیج خان اندجانی کا تھا۔ جس کے اندر نہ صرف زنانہ و مردانہ خوبصورت اور فرح بخش بنگلے تھے۔ بلکہ جس کے فوارے حوض اور جس کے خیابان اور جس کی روشیں ہر ناظر کا دامن دل اس لئے کھینچتی تھیں۔ کہ اس کا چپہ چپہ "درجا ایں جاست" کا مصداق تھا۔

دارا شکوہ لکھتا ہے۔ مرزا کامران نے اپنے باغ کے لئے جو نہر بنائی ہے۔ یہ باغ اس کے جنوب میں واقع ہے۔ اس باغ کے اندر جو عمارت ہے۔ اور جو آجکل خستہ حالت میں ہے۔ حضرت میاں میرؒ دن کو کبھی کبھی یہاں آنکلتے تھے۔ اور یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے ٭

مرزا کامران کے لاہور میں دو باغ تھے۔ ایک باغ کا نام نولکھا باغ تھا۔ جس کے نام پر لاہور میں اب نولکھا محال قائم ہے۔ اور اس میں ریلوے سٹیشن۔ سلطانپورہ۔ مصری شاہ۔ فیض باغ اور بعض اور علاقے شامل ہیں دوسرا باغ اس کی بارہ دری برلب دریا کی حدود میں تھا۔ چونکہ لاہور کے بہت سے شاہی باغات اس زمانہ میں تباہ و برباد ہوئے ہیں۔ جب دریائے راوی نے اپنا رُخ "بندِ عالمگیری" کی وجہ سے شاہدرہ اور اس کے مضافات کی طرف بدلا ہے۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ بعض دیگر باغات کی طرح یہ باغ بھی مرزا کامران کی بارہ دری کے کہیں آس پاس واقع ہوگا۔ اور عہدِ عالمگیری یا محمد شاہی دور میں جب دریا شہر لاہور سے بہت فاصلہ پر ہوگیا تھا۔ دریا برد ہوگیا ہوگا ٭

قلیج خاں کے کچھ حالات مآثرالامراء کی تیسری جلد سے لکھتا ہوں۔ پڑھو اور غور کرو۔ کہ ایسے جلیل القدر امیر نے کس شان و شکوہ اور کس شوق و دلبستگی سے باغ کی تعمیر کی ہوگی۔ جہاں سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ و سنگِ ماہی کا ہُن برس رہا ہوگا۔ کیا کچھ لاگت نہ آئی ہوگی۔

فتح کشمیر (۹۹۴ھ و ۱۵۸۶ء) کے بعد جب اکبر نے راجہ بھگوانداس اور راجہ ٹوڈرمل کو آگرہ سے کشمیر کے انتظام و انصرام کے لئے روانہ کیا ہے۔ تو نواب قلیج خاں کو بھی ان کے ہمراہ کیا۔ جب یہ پارٹی لاہور پہنچی۔ تو بادشاہ نے بعض مہمات ملکی کے سرانجام کے لئے قلیج خاں کو لاہور ہی میں ٹھہرا لیا۔ جہاں گورنر لاہور کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک وہ کام کرتا رہا۔ اکبر کے تیئیسویں سال جلوس میں وہ گجرات (دکن) کی صوبیداری کے منصب پر تھا۔

۱۰۰۵ھ میں شاہزادہ سلطان دانیال کو جب الہ آباد کی گورنری ملی۔ تو قلیج خان جو شاہزادہ کا خسر اور بادشاہ کا سمدھی تھا۔ اکبر کے حکم سے اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ سال جلوس چہل و ششم ۱۰۱۰ھ میں قلیج خاں کو پھر پنجاب کی حکومت ملی۔ اور لاہور اس کا صدر مقام قرار پایا۔ جہانگیر کے زمانہ ۱۰۱۴ھ سال دوم جلوس میں وہ پھر پنجاب آیا۔ اور چھٹے سال جلوس تک لاہور ہی میں رہا۔

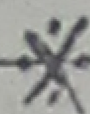
صاحب صلاح و تقویٰ تھا۔ باوجود گورنر پنجاب ہونے کے طالبانِ علم کو خود درس دیتا تھا۔ اس نے لاہور میں ایک دارالعلوم بھی اپنے ذاتی خرچ سے بنایا تھا جس میں فقہ اور حدیث و تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی کوشش سے پنجاب کے مختلف اقطاع میں علوم شرعیہ کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔

قلیج خاں شاعر بھی تھا۔ اور اُلفتیؔ تخلص کرتا تھا۔ یہ رباعی اسکی یادگار ہے

عاشق ہوس وصال در سر دارد صوفی نزرقے زخرقہ در بر دارد
من بندۂ آں کسم کہ فارغ زہمہ دائم دلِ گرم و دیدۂ تر دارد

اندجاں ایران کے کسی قبیلہ یا شہر کا نام ہے۔ اسی لئے اس کو اندجانی کہتے تھے۔ اس کے بیٹوں میں مرزا سیف اللہ اور مرزا چین قلیج بڑے مشہور اور نامی امیر گذرے ہیں۔ اسی قلیج خاں اندجانی ناظم لاہور کی مدح میں دربار جہانگیری کے نامور شاعر طالبؔ نے ایک رات میں ۴۴ بیت کا قصیدہ لکھا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی روانیٔ طبع پر ناز کرتا ہوا لکھتا ہے

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہلِ سخن منم کہ نیست چو من قائلے ز اہلِ کلام
گواہ ایں دو سہ معنی ہمیں قصیدہ بس است کہ یافت از سرِ شب تا سپیدہ دم اتمام



مقبرۂ جہانگیر

(دور اوّل باغ مہدی قاسم خاں)

نواب مہدی قاسم خان اکبر کے نامی اور معزز سرداروں میں تھے۔ ان کے اقتدار کا اس سے اندازہ کر لو۔ کہ ان کا بھانجہ اور داماد حسین خاں ٹکریہ[1] اکبر کے

[1] دربار اکبری میں لکھا ہے۔ ایک دراز ریش مرد معقول اسکو دربار (لاہور) میں آیا حسین خاں مرد بزرگ سمجھ کر تعظیم کو اُٹھے۔ مزاج پرسی کے بعد معلوم ہوا۔ کہ یہ تو ہندو ہے۔ اسی دن حکم جلدی کر دیا کہ ہندو کندھے کے پاس رنگین کپڑے کا ایک ٹکڑا لگوایا کریں۔ لاہور تو زندہ دلوں کا مسکن ہے ٹکڑیہ کیے جسے لوگوں نے لگر یہ نام رکھ دیا۔ چنانچہ اخیر دم تک یہ لفظ نام کا جز و رہا ★

عہد[۱] میں پنجاب کا گورنر رہا ہے ⁂

۹۷۴ھ میں مہدی قاسم خاں اس لاؤ لشکر اور شان و شوکت کے ساتھ حج کو گئے۔ کہ ہندوستان میں دھوم مچگئی۔ گورنر پنجاب سمندر کے کنارے (سورت) تک ان کو رخصت کرنے آیا۔ وہ زمانہ سفر کی آسائشوں اور ریل گاڑیوں کی موج بہار کا نہیں تھا۔ اور نہ ان ایام میں وہ کیفیت تھی کہ لاہور سے چھوٹے تو بمبئی میں جاکے دم لیا۔ اس زمانہ میں منزل منزل بلکہ قدم قدم چلتے تھے۔ اور کم سے کم دو تین سال کے لئے اپنے وطن سے جدا ہوتے تھے۔ نواب مہدی قاسم خاں بھی ۹۷۷ھ میں حج سے واپس آئے۔

مہدی قاسم خاں نے ۹۶۵ھ کے پس و پیش دریائے راوی کے پار ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ کتابوں اور تاریخوں میں باغ کا کوئی خاص نام نظر سے نہیں گذرا۔ سب جگہ باغ مہدی قاسم خاں ہی درج ہے۔ ان کے رسوخ و اقتدار اور ان کے تمول و اعزاز کو نگاہ رکھکر خیال کرو۔ باغ پر اسکی آرائش پہ اس کی عمارات پر کیا کچھ صرف نہ ہوا ہوگا ⁂

یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ اکبر لاہور کی رونق و آبادی کے لئے خود لاہور میں مقیم تھا۔ اس نے خود بھی عالیشان محلات تعمیر کرائے۔ اور اس کی تقلید میں امراء و وزراء نے مکانات و باغات کی کثرت سے لاہور کو عروس البلاد بنا دیا۔

باغ مہدی قاسم خاں میں (بانئ باغ کے انتقال کے بعد) مرزا محمد حکیم اکبر کے سوتیلے بھائی نے ۱½ ماہ تک دن عید اور رات شب برات کا جشن منایا ہے۔ جس کی کچھ کیفیت اس طرح ہے۔ کہ ۹۷۴ھ میں وہ کابل میں تھا۔ وہاں اس کے دماغ میں پنجاب و لاہور پر قبضہ کرنے کا خبط سمایا۔ کابل سے

---

[۱] ۹۶۵ھ میں تقرری کا پتہ چلتا ہے ⁂

فوج عظیم لیکر نکلا۔ اور بھیرہ وغیرہ مشہور مقامات کو لوٹتا ہوا لاہور کی حدود تک آپہنچا۔ اکبر کی طرف سے (حسین خاں ٹکریہ کے بعد) اس زمانہ میں میر محمد خاں حاکم پنجاب تھا۔ اس نے قلعہ کو مستحکم کر کے بادشاہ کو اس ہنگامہ کی خبر پہنچائی مرزا نے اپنے ماہ تک باغ مہدی قاسم خاں میں قیام رکھا۔ قلعہ پر بہت دفعہ حملہ کیا۔ مگر محصورین کی توپ و تفنگ نے ہر بار ناکام رکھا۔ جب سنا کہ اکبر دریائے ستلج عبور کر آیا ہے۔ تو بھاگ کر کابل چلا گیا۔

۹۸۹ھ میں مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو پھر بعض نمک حرام کابلی افغانوں اور نئے پرانے ترکوں کی تحریک و ترغیب سے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا خیال آیا۔ اپنے ہواخواہوں اور اپنی فوجوں سمیت پھر راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں اُترا۔ راجہ بھگوانداس۔ کنور مان سنگھ (بعد میں راجہ مان سنگھ) سید حامد بارہ اور چند امرائے دربار شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔

مرزا حکیم نے بیس یوم تک باغ مذکور میں خوشی کی بہاریں منائی تھیں۔ کہ اقبال اکبری کے سرہند میں پہونچنے کی خبریں گوش زد ہونے لگیں۔ محاصرہ ترک کیا۔ باغ کی بہار سے منہ موڑا۔ اور فراری و اضطراب کے وحشت خارزار میں قدم رکھا۔ جہانگیر کے وسط اور اواخر عہد حکومت میں لوگ مہدی قاسم خاں کا نام بھول چکے تھے۔ اور اگر "بھول چکے تھے" غلط ہے تو "بھول رہے تھے" یقیناً صحیح ہے۔ جیسا کہ اس باغ کے دوسرے دور سے معلوم ہوگا۔

(دوسرا دور باغ دل گشا)

نواب مہدی قاسم خاں کی اولاد نرینہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ جو حسین خاں ٹکریہ کی بیوی تھی۔ البتہ حسین خاں کا ایک بیٹا یوسف خاں

جہانگیر کے دربار میں تھا۔ یوسف خاں کا ایک بیٹا عزت خاں تھا۔ جو شاہجہان کی سلطنت میں حقِ خدمت ادا کرتا تھا۔ اس کے آگے میدان صاف نظر آتا ہے۔

جب مہر النساء نور محل اور نور محل سے نور جہاں بنی۔ اور اس کے عروج و اقبال کی ضیاء پاشیوں کے آگے کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ رہی۔ تو اس نے مہدی قاسم خاں کے باغ پر جو اس زمانہ میں لاہور کا ایک بے نظیر باغ اور بے مثال سمجھا جاتا تھا۔ اپنا قبضہ کر لیا۔ اور اس قبضہ کی کچھ یہ وجہ بھی تھی۔ کہ اس زمانہ میں کسی امیر وزیر کے انتقال پر اور خصوصاً اولادِ نرینہ سے محروم مرنے پر اسکی جائداد بادشاہِ وقت کا حق سمجھی جاتی تھی۔

نور جہاں نے اس باغ کا نام دلکشا رکھا۔ اور دل کھول کر اس کو رونق دی۔ اس کی طبیعت میں اختراعات و ایجادات کا مادہ تھا۔ گلزار و مرغزار اور قدرتی نظاروں کی عاشق تھی۔ خدا جانے باغ کو کیا کچھ سجایا ہوگا۔ کس قسم کی رونق دی ہوگی۔ جب اس میں بیگمات کا جھرمٹ ہوتا ہوگا۔ تو کس اہتمام سے پردہ اور پہرہ کا انتظام ہوتا ہوگا۔

مہر مہنگا ولد مہر جیٹھا بانیٔ باغبانپورہ (لاہور) کے ننھیال باغ دلکشا کے داروغہ تھے۔ جب شہزادے اور شاہزادیاں اور بیگمات باغ دلکشا کی سیر کو آتے تھے۔ تو مہر مہنگا اپنی خورد سالی کیوجہ سے باغ کے اندر ہی رہتا تھا۔ اسی تعارف و تقرب کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ میں شالامار باغ اور دیگر باغہائے سرکاری کا داروغہ مقرر ہو گیا تھا۔ مہر مہنگا نے ۱۰۸۰ھ میں انتقال کر گیا۔

اس ثبوت میں کہ باغ دلکشا اسی باغ کا نام ہے۔ جو مہدی قاسم خاں نے اکبری عہد میں احداث کیا تھا۔ مولانا آزاد کی چند سطور یہاں درج کرتے ہیں جو انہوں نے دربارِ اکبری میں اکبر کے بھائی مرزا حکیم کی بغاوت کا ذکر کرتے

ہوئے لکھی ہیں۔ فرماتے ہیں:" مرزا حکیم اٹک اُتر کر بھیرہ کو لوٹتے ہوئے لاہور آ گئے۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں جہاں اب مقبرہ جہانگیر ہے آن اُترے[1]"

(تیسرا دور مقبرہ جہانگیر)

جہانگیر نے ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں راجوری کے متصل جب مقام چنگس[2] میں وفات پائی۔ تو موت سے پیشتر لاہور میں دفن کئے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ جہانگیر کو اپنے باپ کی طرح خطۂ لاہور سے بڑی محبت تھی۔ اور شاید اس لئے بھی تھی۔ کہ اس کی چاہتی بیگم نور جہاں لاہور کی بہت دلدادہ تھی۔ بلکہ جہانگیر کے مرنے کے بعد اپنے آخری وقت (۱۰۵۵ھ) تک اس نے لاہور سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بلکہ مر کر بھی لاہور ہی میں دفن ہوئی۔ اس کا ذیل کا شعر اسکی اس محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو مرتے دم تک اسے لاہور کے ساتھ تھی ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم جاں دادہ ایم جنّت دیگر خریدہ ایم

بہرحال جب جہانگیر کی لاش لاہور آئی۔ تو اس کی رفیق زندگی نور جہاں کے باغ دلکشا واقع شاہدرہ میں دفن کی گئی۔ جس پر بعد میں شاہجہان نے ایک

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۸۲۹ [2] چنگس راجوری اور تھنہ کے درمیان پنجاب سے براہِ گجرات و بھمبر کشمیر کو جاتے ہوئے دامنِ کوہ میں برلب دریائے بتیا ایک چھوٹا سا پڑاؤ آتا ہے۔ یہاں ڈاک بنگلہ اور پولیس چوکی کے پاس ایک قبر ہے۔ جس پر سبز جھنڈا آویزاں رہتا ہے۔ میں نے وہ قبر پونچھ (کشمیر) جاتے ہوئے دیکھی ہے معمولی سی قبر ہے۔ اس پر اینٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ شہنشاہ جہانگیر کی قبر ہے۔ لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

عالیشان عمارت تعمیر کی۔ جو آج مقبرہ جہانگیر کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس نے اس قدر شہرت و عظمت حاصل کر لی ہے۔ کہ آج نہ کوئی مہدی قاسم کا نام جانتا ہے اور نہ کسی کو اس کے دل کشا ہونے کا حال معلوم ہے۔

جب تک مغلیہ حکومت برسر اقتدار رہی۔ مقبرہ کی عالیشان عمارت کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا۔ یہاں تک کہ ۱۷۵۲ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور کے مغل گورنر نواب میر معین الملک عرف میر منو کو چار ماہ تک لڑائی کرنے کے بعد آخر شکست دی ہے۔ تو اس زمانہ میں بھی مقبرہ جہانگیر اور باغ دلکشا کی عمارتیں ہر قسم کے صدمہ سے محفوظ تھیں۔ نواب معین الملک نے پچاس لاکھ روپیہ نقد چند راس اسپ اور زنجیر فیل معہ ہودج نقرہ دیکر اپنی جان بچائی۔ اور ان تمام اشیاء کے معاوضہ میں سوا لاکھ روپیہ کا خلعت صلح حاصل کیا۔ اس فاتحانہ صلح کے بعد احمد شاہ نے مقبرہ جہانگیر اور باغ دلکشا کی وسیع اور دلچسپ اراضی میں صلح کا جشن دھوم دھام سے منایا۔ اور چند روز تک عیش و عشرت کا بازار گرم کر کے کابل چلا گیا۔

۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۸ء تک سہ حاکمان لاہور نے لاہور میں جو اودھم مچایا ہے۔ اور اسلامی عمارات کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد سکھوں کی سلطنت (از ۱۷۹۹ء تا ۱۸۴۹ء) میں شہنشاہوں اور غزنیوں کی اس آخری منزل مقبرہ کو جو حادثے پیش آئے ہیں۔ ان کی کیفیت نہایت دردناک ہے۔ ہم تھوڑا تھوڑا ذکران واقعات کا کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۱۷ء تا ۱۸۴۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ چار پلٹنیں اور دو توپخانے لیکر اس غرض سے قلعہ سے نکلا۔ کہ مٹھہ ٹوانہ کے قلعہ نورپور کو اپنے قبضہ میں لائے۔ اور سردار دل سنگھ قلعدار ملکھڈ کی مدد کرے۔ پہلی منزل مقبرہ جہانگیر قرار پائی۔ سکھ سواروں نے باغ کو تہس نہس کر دیا۔

اسی اثناء میں خبر آئی - کہ قلعہ نورپور فتح ہو گیا ہے - مہاراجہ نے اسی باغ مقبرہ جہانگیر میں جشن منایا - لاہور سے اور بھی بہت سی فوجیں منگوائیں - اور باغ کو بہت حد تک ویران کر دیا -

۱۸۱۸ء میں مہاراجہ نے مہم پشاور کی تیاری کے لئے مقبرہ جہانگیر میں پندرہ دن تک قیام کیا - مہاراجہ اور اس کے نامی جاگیردار اور سردار اور ماتحت راجے مقبرہ کی عمارات اور سرائے اور سرائے کی مسجد میں مقیم رہے ہ

باغ کے عین وسط میں جہانگیر کا مقبرہ ہے - جس کی چھت پر سنگ مرمر کی سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے - اور جس کے فرش اور تعویذ مرقد اور چبوترہ کی گلکاری بھی عجب بہار دے رہی ہے - سنگِ عقیق - لاجورد آسمانی - ابلق - کنٹھ - زہر مہرہ - مرجان اور سنگ ابری وغیرہ نے فرش کو دیدہ زیب بنا دیا ہے - جب نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے پنجاب اور دہلی پر ہوئے - تو ایرانیوں اور درانیوں نے گلکاری کو جواہرات سمجھ کر کسی کسی جگہ سے اکھاڑ لیا - سکھوں کے زمانہ میں پہلے یہاں ارجن سنگھ بن ہری سنگھ نلوہ مقیم رہا - اس نے بھی باغ اور مقبرہ کو اجاڑنے میں پوری سنگدلی سے کام لیا ہ

جب سردار سلطان محمد خاں برادر عمری امیر دوست محمد خاں والئے کابل مہاراجہ کے پاس آیا - تو شاہدرہ معہ مقبرہ اس کو جاگیر میں ملا - وہ بارہ سال تک زندہ درگور مقبرہ کے اندر رہا - اس نے اور اس کے آدمیوں نے مقبرہ کے پتھروں اور نگینوں اور مقبرہ کے باغ کو بہت کچھ ویران کیا ہ

مہاراجہ نے بھی تمام کٹہرہائے سنگِ مرمر - سنگِ سرخ اکھڑوا کر دربار صاحب امرتسر اور رام باغ میں نصب کرائے - اس پر بھی اس مکان عالیشان کا وہ جاہ و جلال ہے - کہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں - مقبرہ کے

چار مینار ہیں۔ ہر مینار کی تین منزلیں ہیں۔ اور ہر منزل پر جانے کے لئے بادشاہی مسجد کی طرح سیڑھیاں موجود ہیں۔ ہر منزل کے گرد ہشت پہلو سنگ مرمر کا جالی دار کٹہرہ موجود تھا۔ مگر سکھوں نے سب اُتروا لیا۔ اسی طرح چھت کی وسیع و طویل منڈیر بھی جالیدار سنگِ مرمر کی تھی۔ وہ بھی بیدردوں نے اُتروالی۔ اب سرکار انگریزی کی توجہ سے پھر سنگ مرمر کی جالیاں لگ رہی ہیں۔ سرکار انگریزی نے اس باغ اور مقبرہ کی عمارت کو از سر نو رونق بخشی ہے۔ قبر کے تعویذ کے گرد تین طرف سنگِ مرمر کی بلند جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر ابھی تک شاہجہانی نقش و نگار موجود ہیں۔ زمین اس باغ کی جو چار دیواری کے اندر ہے۔ ایک سو بیگہ ہے۔ تیس بیگہ زمین عمارتی ہے۔ جس پر سڑک پختہ مع فوارہ وغیرہ موجود ہے۔ اور بقیہ مزروعہ ہے۔ ہر گوشہ میں چار چار تختے ہیں۔ اور ہر تختہ میں نہر رواں اور سڑک پختہ ہے۔ اور اشجار ثمردار اور سبزہ زار کا عالم اور انگریزی طرز کے گل بوٹے آنکھوں کو طراوت دیتے ہیں۔

مقبرہ کے گرد آٹھ عالیشان حوض ہیں۔ ہر حوض میں چھوٹی چھوٹی آبشاریں ہیں۔

باغ کی آبیاری کے لئے بادشاہی زمانے کا بڑا کنواں چار دیواری کے باہر دروازہ سرائے و مسجد سے دائیں ہاتھ پر ہے۔ پہلے اسی چاہ کلاں کے پاس سے مقبرہ کا راستہ تھا۔ مگر اب چند سالوں سے یہ راستہ بند ہے۔ یہ کنواں چھ چاہ چرخ چوب والوں کا کام دیتا تھا۔ باغ کے اندر چار کنوئیں ہیں۔ غربی کنواں نہال سنگھ احد الحاکم لاہور کا تعمیر کردہ ہے۔ شمالی فقیر عزیز الدین نے بنوایا تھا۔ شرقی کنواں راجہ فیض طلب[1] خاں۔ اور جنوبی چاہ مسٹر ویڈربرن ڈپٹی کمشنر لاہور نے

---

[1] بھمبر کا راجہ تھا۔ جو آجکل ریاست جموں کی ایک تحصیل ہے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۴۲)

جاری کرایا تھا۔

مقبرہ کی چار دیواری کے ساتھ ہی غربی جانب ایک عالیشان اور وسیع سرائے ہے۔ جس کو ایک بلند اور خوبصورت ڈیوڑھی نے باہم ملحق کر دیا ہے اس سرائے میں تین گنبدوں کی ایک وسیع مسجد بھی ہے۔ صحن مسجد کا خشتی استر کار حوض موجود ہے۔ مگر اس کا فوارہ بند ہے۔ اسی سرائے میں ۱۸۹۶ء میں غلام پہلوان مرحوم اور گلاب سنگھ کی کشتی ہوئی تھی +

قلعۂ لاہور

لاہور کا عظیم الشان شہر ہر چند صدیوں سے دار الحکومت چلا آرہا ہے لیکن پختہ قلعہ بنانے کا کبھی کسی کو خیال نہ آیا۔ بعہد محمود غزنوی ۴۱۲ھ میں یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ اس زمانہ سے لے کر لودھیوں کے آخری دور اور مغلیہ حکومت کے ابتدائی دو بادشاہوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کہ اس شہر کی شان و اہمیت کے مطابق یہاں ایک مستحکم قلعہ بھی بنانا چاہئے +

عہد اکبری۔ اکبر کے زمانہ سے مغلیہ حکومت کا عہد زرین شروع ہوتا ہے سب سے پہلے اسی بادشاہ نے لاہور کی آبادی و رونق کے لئے ایک

راجہ دھیان سنگھ وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عداوت نے جو قلمرو جموں کے تمام راجگان کو نابود کر کے اپنے خاندان کا واحد سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔ راجہ فیض طلب خاں کو بہت نقصان پہونچایا۔ آخر بیچارے کو ریاست سے خارج کر کے لاہور میں نظر بند رکھا گیا۔ اور بجبر شامل خالصہ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۱ء کے قریب کا ہے +

عظیم الشان قلعہ کی ضرورت محسوس کی۔ پرانے قلعہ کو جو نہ شاندار تھا اور نہ مستحکم بلکہ آب و گل کا ایک بھدا سا مجموعہ تھا۔ ڈھایا۔ اور اس کی بنیادوں پر پختہ خشتی قلعہ بنوایا۔ اور اس میں عالیشان ایوانات تعمیر کرائے۔ اس کو اس قدر فراخ کیا۔ کہ اس میں خاصہ ایک شہر آباد ہو سکتا تھا۔ قلعہ کی دیوار نہ صرف پختہ اور بلند ہی ہے۔ بلکہ اس قدر چوڑی ہے۔ کہ اس پہ توپ آسانی سے چل سکتی ہے۔ اس قلعہ نے اکبر کے زمانہ سے دور انگلشیہ کے موجودہ ایام تک جس کو آج سوا تین سو سال کے قریب عرصہ ہو چکا ہے۔ عیش و عشرت کے جلسے قتل و غارت کے ہنگامے اور خوشی و غم۔ تخت و تختہ اور موت و حیات کے عبرت انگیز انقلابات عظیم دیکھے ہیں۔ ہم سلسلہ وار ان کا تھوڑا تھوڑا ذکر کرتے ہیں۔

یہ قلعہ شہر کے شمالمغربی حصہ میں ہے۔ اور گو اس کی بیرونی دیواریں کہیں مقامات سے شکستہ ہو گئی ہیں۔ لیکن اب بھی عظمت گذشتہ اس کی ایک ایک اینٹ سے نظر آرہی ہے۔ اسی قلعہ میں بیٹھ کر اکبر نے فتح کشمیر اور کوہستان سوات وغیرہ کی تنبیہہ و تادیب اور قندہار و کابل کے انتظامات کے احکامات جاری کئے ہیں۔ اکبر کی مذہبی آزادی کا شباب و شوق پنڈتوں اور مسلمانوں بلکہ پادریوں تک کے مذہبی و علمی مناظرے اسی قلعہ میں دیکھتا رہا ہے۔ شاہی ایوانات کی دیواروں پر جو نظر دوڑاؤ۔ تمہیں بہت سی منقش تصویریں نظر آئینگی ان میں مرزا رستم سابق شاہِ قندہار۔ خان خاناں۔ راجہ مان سنگھ اور خان اعظم بڑے شان و شکوہ سے بیٹھے ہوئے دکھائی دینگے۔

بادشاہ خود تو مذہبی قیود سے آزاد تھا۔ اور اس کے اکثر اہل غرض درباری بھی اس کے مُریدانِ خاص میں شامل تھے۔ لیکن پھر بھی بعض ایسی نیک ہستیاں

موجود تھیں۔ جو خداوند مجازی کی فرمانبرداری کے ساتھ ہی خداوند حقیقی کی اطاعت
گذار بھی تھیں۔ انہی لوگوں کے لئے بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ قلعہ میں دیوانِ عام
کے سامنے جو چبوترہ ہے۔ اس پر ایک مختصر سی مسجد بنوادو۔ کہ بعض اشخاص
بحالتِ حضوری کارِ ضروری میں مصروف ہوتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو انہیں
دور نہ جانا پڑے۔ ہمارے سامنے نماز پڑھیں اور پھر حاضر ہو جائیں۔ درباری
حکیموں میں حکیم مصری کے نام سے ایک حکیم تھے۔ جن کو شیخ فیضی سفارتِ
دکن سے واپسی پر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ بڑے خوش مزاج۔ ظریف طبع۔
طب میں ماہر کامل اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں فرد وحید۔ انہوں نے تعمیر مسجد پر
دو شعر لکھے۔ بادشاہ کی مذہبی آزادیوں اور اس کے مذہبی عقائد کو ذہن میں رکھ
کر دیکھو۔ ان دو شعروں کے مختصر سے نوکش میں دوسرا شعر کیسا تیر نشتر چبھو
رہا ہے۔ فرماتے ہیں:-

شاہِ ما کرد مسجدے بنیاد ایہا المومنون مبارکباد
ہندریں نیز مصلحت دارد تا نمازاں گذار بشمارد

اس زمانہ میں دریائے راوی کی لہریں ثمن برج کے پاؤں میں لوٹتی اور
اس کی موجیں قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتی تھیں۔ چنانچہ ۹۹۷ھ میں
جب اکبر نے شیخ کمال بیابانی کو اس کی جعلسازی کی سزا دینی چاہی تو حکم
دیا۔ کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعہ کے برج پر سے دریا میں گرا دو۔
اگر کچھ کرامت ہے۔ تو صحیح سلامت باہر نکل آئیگا۔ ورنہ اپنے کئے کی سزا پائیگا
آج دریائے راوی جو قلعہ سے دو میل پرے ہٹ گیا ہے۔ اور قلعہ کی دیواروں
کی بجائے مرزا کامران کی بارہ دری سے سر ٹکرا رہا ہے۔ اس زمانہ میں قلعہ کے
اس قدر نزدیک تھا۔ کہ ثمن برج سے اگر کسی آدمی کو نیچے گرایا جاتا۔ تو بھی

ے دربار اکبری مولانا آزاد صفحہ ۶۱

خشک زمین دریا کی صورت میں اپنا منہ کھولے ہوئے اس کو نگل جانے کے
لئے تیار رہتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ قلعہ کے اندر جو محلات و مکانات،
مشرق کی طرف ہیں۔ وہ اکبری عہد کے بنے ہوئے ہیں +

دور جہانگیری۔ جہانگیری عہد (سنہ ۱۰۱۴ھ) شروع ہوتے ہی قلعہ لاہور
پر خون خرابہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کا بیٹا خسرو آگرہ سے بھاگ کر لاہور
آیا۔ اور باپ کا مقابلہ کرنے لگا۔ لاہور کے عمال شاہی نے شہر کے دروازے
محفوظ و مضبوط کر لئے۔ اور قلعہ کے برجوں اور اس کی دیواروں میں جہاں
جہاں شکست و ریخت تھی اس کی مرمت کی۔ اور قلعہ کی دیواروں پر توپیں
چڑھا دیں۔ خسرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ کہ اگر قلعہ کو فتح کر لو۔ تو کامل سات
یوم تک تم کو شہر کے لوٹنے کی اجازت دی جائیگی۔ ابھی لڑائی شروع ہی ہوئی
تھی۔ کہ جہانگیر کے آگرہ سے روانہ ہونے بلکہ لاہور کے قریب پہونچ جانے
کی خبر ملی۔ خسرو نے یہ سن کر لڑائی ترک کر دی۔ اور باپ کو روکنے کا انتظام
کیا۔ مگر گرفتار ہوا۔ اور اپنے سپہ سالاروں اور ہمراہیوں کو کچھ جنگ میں قتل کرا کر
اور سات سو کو پھانسی دلوا کر آپ قلعہ لاہور میں نظر بند ہو گیا۔ اور آخر پانچ
سال کے بعد اسی قلعہ میں مر گیا +

جہانگیر لکھتا ہے۔ میں محرم ۱۰۱۵ھ پنجشنبہ کے دن قلعہ کے اس گنبد میں
بیٹھا۔ جو میرے والد ماجد نے ہاتھیوں کی کشتی کا تماشا دیکھنے کے لئے بنوایا تھا۔
اسی گنبد میں بیٹھ کر میں نے خسرو کے سات سو باقی ماندہ ہمراہیوں کو پھانسی
دیئے جانے کا حکم دیا +

اس واقعہ کے بیس سال بعد ۱۰۳۵ھ میں جہانگیر نے ایک سرحدی ڈاکو
احداد نام کی گوشمالی کے لئے بادشاہی فوج کو روانہ کیا۔ لڑائی ہوئی اور اسمیں

وہ راہزن جو ایک کثیر جماعت کو لیکر بادشاہی علاقوں پر دست درازی کیا کرتا تھا مارا گیا۔ ۱۹ محرم کو بادشاہ کشمیر روانہ ہونے والا تھا۔ اسی اثنا میں احداد کا کٹا ہوا سر اس کی خدمت میں پیش ہوا۔ حکم ہوا کہ اسکو قلعہ کے دروازہ پر لٹکا یا جائے۔ اور خوشی کے شادیانے بجوائے جائیں۔

جہانگیر نے قلعہ میں عمارات کو بہت توسیع دی۔ برج نما عمارتیں بہت سی اسی کی بنوائی ہوئی ہیں۔ سنہ ۱۰۳۶ھ مطابق سنہ ۱۶۲۶ء میں سر تامس ہربرٹ ایک نامی برطانوی سیاح نے جہانگیر کی موت سے ایک سال پیشتر لاہور کو دیکھا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ افریقہ و ایشیا میں قلعہ کی عمارات کے متعلق لکھتا ہے۔ "قلعہ کے اندر ایک محل ہے جس کے دو دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ دربار اور جھروکہ کو جاتا ہے۔ جہاں بادشاہ اپنی عام خاص رعایا کو درشن دیتا ہے۔ دوسرا دروازہ دیوان خاص کی راہنمائی کرتا ہے۔ جہاں رات کو آٹھ سے گیارہ بجے تک بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ بات چیت کرتا ہے۔ محلات و عمارات کی دیواروں پر کئی تصویریں ہیں۔ بعض تفریح طبع کے لئے ہیں اور بعض سے کئی تاریخی معاملات کا انکشاف ہوتا ہے۔ جہانگیر ایک تصویر میں چوکڑی جما کر قالین پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک تصویر میں دائیں طرف اس کا بیٹا سلطان پرویز اور بائیں طرف شاہزادہ خورم ہے۔ اسی طرح آصف جاہ راجہ جگن ناتھ۔ خان اعظم کے بھائی مرزا شریف کی تصویریں بھی ہیں۔ شریف کے گرد تو ایک سولونڈیوں کا جمگھٹا بھی ہے۔ جس سے اس کا جاہ و جلال اور اس کی عیش و عشرت کا حال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ راجہ رامداس شمشیر بردار۔ راجہ مان سنگھ نگس دان۔ مقرب خاں مسخرہ۔ راجہ برن سنگھ راجہ بیر سنگھ کی تصویریں کھینچے

ا۔ تاریخ لاہور انگریزی مطبوعہ سنہ ۱۸۹۲ء مصنفہ جج محمد لطیف مرحوم ۔

کے قابل ہیں۔ دروازوں پر یسوع مسیح کی کنواری ماں (حضرت مریم) اور صلیب کی تصویریں ہیں۔ ایک مقام پر بابر اور اس کے تین امرا بھی بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امراء کے جلوسوں اور پریوں کی تصویروں اور دوسری تمام قسم کی تصویروں پر ہندو مصوری کا اثر غالب ہے"[1]

جہانگیر ۱۲ بجے دوپہر کو قلعہ کے جھروکہ میں آتا۔ اور ہاتھیوں اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں دیکھتا۔ جہانگیر کو لاہور بہت پسند تھا۔ اس نے اپنی عمر کا آخری حصہ اپنی پیاری بیگم ملکہ نورجہاں کے ہمراہ اسی شہر اور اسی قلعہ میں بسر کیا۔ اُن دنوں عجیب لطف ہوتا ہوگا۔ اکبر کے حالات میں دیکھ چکے ہو دریائے راوی قلعہ کے پاؤں میں لوٹتا تھا۔ اس کا ثبوت کہ دریا اس زمانہ میں واقعی قلعہ کے پاس ہی بہتا تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی ملتا ہے۔ جب خسرو بن جہانگیر کے آدمی لاہور کے ایک دروازہ کو آگ لگا رہے تھے۔ سعید خان نام ایک بادشاہی امیر راوی پر آیا۔ اور اُس نے کشتی کے ذریعہ قلعہ میں دلاور خاں کو پیغام بھیجا۔ کہ میں مدد کے لئے آیا ہوں۔ لیکن میرے پاس کشتیاں نہیں ہیں۔ کہ میں اپنے آدمیوں کے ہمراہ قلعہ میں داخل ہوسکوں اہل قلعہ نے سعید خاں کو بیس بڑی کشتیاں بھیجیں۔ جن پر وہ ہمراہیوں سمیت سوار ہو کر قلعہ میں آگیا۔ یہ واقعہ ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۶ء کا ہے۔

جہانگیر نے انیسویں سال حکومت یا ۱۰۳۴ھ میں قلعہ کا شاہ برج تعمیر کرایا۔ جس میں شاہجہان نے اپنے عہد میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح کی۔ قلعہ کے اندر ایک مسجد اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ ایک مسجد بیگمات اور حرم سرا کی عورتوں کے لئے جہانگیر نے تعمیر کرائی تھی۔ نام اس کا موتی مسجد رکھا۔ یہ مسجد

---

[1] اے ناریخ ہند مولانا ذکاء اللہ کارنامہ جہانگیری

تخت کے غربی جانب ہے۔عبادت کے لئے پچاس فٹ لمبی اور ۲۳ فٹ چوڑی جگہ مخصوص کی گئی ہے۔مسجد کے دروازہ پر جو کتبہ کندہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔۱۰۰۶ھ میں "بادشاہ کے ناچیز خادم" معمور خاں کے زیر اہتمام بنی تھی۔

عہد شاہجہانی۔ شاہجہان نے رجب کے بعد شعبان یا رمضان ۱۰۳۷ھ میں سال جلوس اول ہی میں حکم دیا۔کہ لاہور اور دہلی کے قلعوں میں ایوان چہل ستون تعمیر کئے جائیں۔چنانچہ دہلی کی طرح لاہور کے قلعہ میں بھی شاہجہانی عمارات شروع ہوئیں۔چہل ستون جو چالیس یوم میں تیار ہو گیا۔دیوان عام کی ایک عالیشان خوشنما عمارت ہے۔یہ عمارت اس لئے بنائی گئی۔کہ جب بادشاہ دیوان عام میں دربار کرتے تھے۔تو تابش آفتاب اور نزول باران کی زحمت سے بچنے کے لئے بندگان شاہی کے سر پر کوئی سایہ نہ ہوتا تھا۔یہ عمارت دولت خانہ خاص و عام کے جھروکہ کے سامنے تعمیر کی گئی۔اس کا محجر یعنی کٹہرہ چاندی کا تھا۔چہل ستون کی عمارت ستر گز لمبی اور بائیس گز چوڑی تھی۔ایوان کی تین طرفیں کھلی ہیں۔جن میں سے اُمراء منصب دار اور خدمت پیشہ لوگ آتے جاتے تھے۔جو حسب مراتب اپنے اپنے مقامات پر بیٹھ جاتے تھے۔اس عمارت کے آگے ایک وسیع صحن تھا۔جسکے گرد رنگین چوبی محجر عجب بہار دیتا تھا۔پھر جب اس پر مخمل و زربفت کا سائبان کھڑا کیا جاتا تھا۔اور اس میں دو صدی منصب دار اور اُمراء و زرائے درباری جمع ہوتے تھے۔تو عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی۔دونوں محجروں کے دروازوں پر گرز برداروں اور دربانوں کا جن کا لباس تا حسنرہ بجائے خود ان کی امارت اور ان کے منصب کی علامت تھی۔پہرہ

رہتا تھا۔ شاہجہان ۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۴ء میں ۱۳ شعبان کو آگرہ سے روانہ ہو کر ۱۲۔ شوال کو لاہور پہنچا۔ آصف خاں جو یمین الدولہ آصف جاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور نور جہاں کا بھائی تھا۔ اُس زمانہ میں لاہور کا گورنر تھا۔ بادشاہ نے قلعہ کی عمارات میں شاہ برج اور دولت خانہ خاص اور آرامگاہ دولت خانہ کی عمارتوں کو جو جہانگیر کے زمانہ کی بنی ہوئی تھیں پسند نہ کیا۔ آصف جاہ اور نواب وزیر خاں کو ان کے از سر نو تعمیر کئے جانے کا حکم دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔ کہ ہماری مراجعتِ کشمیر سے پہلے پہلے یہ عمارات تعمیر ہو جائیں۔ ایک ماہ سترہ یوم کے قیام کے بعد بادشاہ ۲۴۔ ذیقعد کو کشمیر روانہ ہو گیا۔ دیوان خاص کے متعلق درباری شاعر طالبا کلیم نے یہ قطعہ لکھا ہے

این تازہ بنا کہ عرش ہمسایۂ اوست	رفعت کرونے زرتبۂ پایۂ اوست
باغیست کہ ہر ستون سبزش سرویست	کا سائش خاص و عام در سایۂ اوست

جس دروازہ پر آجکل انگریزی سپاہی پہرہ دیتے ہیں۔ اور جس کے باہر لوہے کا ایک بلند جنگلہ ہے۔ اور جو سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عین بالمقابل ہے۔ اس کو طے کرنے کے بعد ایک اور دروازہ حضوری باغ کے سامنے آتا ہے۔ جس کو ہاتھی پاؤں۔ ہاتھی پول یا ہاتھی پوڑ دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دروازہ قلعہ کے شمال مغربی رُخ پر ہے۔ اس دروازہ سے حرم سرائے

۱؎ ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۷۶ و تاریخ لاہور انگریزی بحوالہ عبد الحمید لاہوری مصنف شاہجہان نامہ ۲؎ یہ مضمون اکتوبر ۱۹۲۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں قلعہ سول حکام کے حوالہ کر دیا گیا۔ اب انگریزی سپاہیوں کی جگہ ایک دیسی سپاہی پہرہ پر کھڑا رہتا ہے۔ اور جنگلہ بالکل اٹھا دیا گیا ہے۔ مفصل ذکر آگے آئیگا

کی عورتیں اور بیگمات ہاتھیوں پر سوار ہو کر باغات لاہور اور نواح لاہور کی سیر کیا کرتی تھیں۔ دروازہ کی منقش محراب پر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہوئے ہیں

شاہِ جم جاہ سلیماں قدر کیواں بارگاہ — کز سپہر و مہر بر تر بردہ رایاتِ جلال
ثانی صاحبقراں شاہ جہاں کز عدل و جود — نیستش نوشیرواں مانند افریدوں ہمال
شاہ جم حکم کرد احداث کز فرط علو — ہست بیروں ہمچو عرش اعظم از وہم و خیال
در صفا و رفعت و لطف و ہوا برجے چنیں — از حصار چرخ ننمود است کنماید جمال
بندۂ یکدل مرید معتقد عبد الکریم — بعد اتمام عمارت یافت ازیں تاریخ سال
دائما چوں دولت ایں بادشاہِ جم سپاہ — ایں ہمایوں برج عالی باد از آفت بے زوال

ہشتم سنہ جلوس ؁

شاہجہان نے قلعہ میں بہت سی جدید عمارتوں کا اضافہ کیا۔ چہل ستون شاہ برج۔ تختگاہ۔ خوابگاہ خورد۔ نقار خانہ اور نقار خانہ کے ساتھ باغ[1] غرض لاکھوں روپے نئی تعمیرات میں اس نے صرف کر دیئے۔ مثمن برج کی عمارت سنگِ مرمر کی ہے۔ چھتیں مطلا اور مذہب۔ دروازوں پر شیشہ کا جلیدار کام شاہانِ مغلیہ کے گورنر اور ناظم اسی مکلف مکان میں رہا کرتے تھے۔ خوابگاہ خورد ایسی مختصر و مقطع عمارت ہے۔ کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مغربی دیوار کے قریب مثمن برج اور شیش محل موجود ہیں۔ قلعہ کی یہ عمارتیں اب بھی ایسی ہی محفوظ ہیں۔ جیسی کہ شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں تھیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ انہیں مغل بادشاہوں اور اُن کے جانشینوں

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد ۱۲۱۲ھ میں یا اُس کے قریب حافظ عظیم اللہ باغبانپوری کا بیٹا رحیم بخش کچھ عرصہ تک اس باغ کا داروغہ رہا ہے تحقیقات چشتی صفحہ ۶۵۴

نے کبھی فوجی بارکوں کے لئے استعمال نہیں کیا۔ مغربی جانب ایک نولکھا محل ہے۔ ہرچند اس کی عمارت اب خستہ ہے۔ اور چھت بھی اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اسے خوشنما پتھر کے بنے ہوئے پھولوں سے جو دیواروں میں نصب ہیں سجایا گیا ہے۔ کہتے ہیں۔ اس پر نو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس عمارت کو شاہجہان نے بنایا۔ اور اس کے بعد اورنگ زیب نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔

جہانگیر کی وفات (۲۷ صفر ۱۰۳۷ھ) کے وقت اس کا بیٹا شہریار[۱] لاہور میں تھا۔ اور اس کے ساتھ اور بھی کئی شہزادے اسی قلعہ میں تھے۔ آصف جاہ نے لاہور آکر شاہزادوں کو باہم لڑوا دیا۔ اور ہزارہا آدمی ہلاک کرانے کے بعد ان تمام شاہزادوں کو بھی ۲ جمادی الاول یعنی جہانگیر کی وفات کے تیسرے مہینے کے بعد تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اپنے داماد شاہجہان کو تخت وسلطنت کی مبارکباد دی۔ اور یمین الدولہ آصف خان کا خطاب حاصل کیا۔ یہ سب شاہزادے اسی قلعہ کے اندر ہلاک کئے گئے تھے۔ مسجدوں کے علاوہ قلعہ کے اندر ایک مندر بھی ہے[۲]۔ جو اب تک محفوظ وسلامت ہے اور جو مغل شہنشاہوں کی مذہبی فراخدلی کا ایک روشن ثبوت ہے۔ یہ مندر ایک گہرے خلاء یعنی تہ خانہ میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ چھوٹا سا مندر راجہ رامچندر جی کے بیٹے راجہ لوہ بانئے لاہور کا بنایا ہوا ہے۔ مندر کی سطح اور قلعہ کی بیرونی سطح چونکہ مساوی ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مندر بہت پرانا ہے۔ اور قلعہ کے تعمیر کرنے والوں نے اس کو صحیح وسلامت رہنے

---

[۱] شہزادہ داور بخش اور اس کا بھائی گرشاسپ بن خسرو بن جہانگیر۔ شہریار بن جہانگیر۔ طہمورث ہوشنگ پسران دانیال خلف اکبر۔

[۲] تاریخ لاہور انگریزی۔

دیا ہے ٭

اس مندر کے متعلق سناتن دھرم یودک سبھا لاہور گورنمنٹ کے ساتھ کچھ عرصہ سے خط وکتابت کر رہی ہے۔ چنانچہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو یودک سبھا کے ممبران معہ صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ موقع دیکھنے کے لیے گئے۔ اور چاروں طرف سے صفائی اور کھدائی شروع کرادی گئی۔ مندر یا سمادھ کے متصل ہی ایک گہرا گڑھا ہے۔ جس میں ایک خستہ سا گنبد نظر آتا ہے۔ گڑھے کی یہ سطح دو فٹ اوپر تک اینٹوں اور مٹی سے دبی ہوئی ہے۔ اس سے دو فٹ نیچے ایک فرش نکلا ہے۔ جس کی سطح حضوری باغ کی سطح کے برابر ہے۔ صفائی اور کھدائی کے بعد ۱۳۔ دسمبر کو سمادھ میں سے ہاتھوں کی اُنگلیوں کی ہڈیاں جو موجودہ نسلوں کی اُنگلیوں سے بہت بڑی ہیں۔ اور نہایت تیز دانت برآمد ہوئے۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس وقت کے انسان آجکل کے انسانوں کی نسبت قدو قامت میں زیادہ لمبے اور طاقت جسمانی میں بھی زیادہ تھے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ ہڈیاں دھپول مہاراجہ رامچندر جی کے بیٹے راجہ لو کی ہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے خیال میں یہ ہڈیاں مہاتما بدھ سے بہت پہلے زمانہ کی ہیں۔ اور کسی غیر معمولی انسان کی ہیں ٭

دَورِ عالمگیری۔ عالمگیر شہزادگی کے زمانے میں اپنے دوسرے بھائیوں کے ہمراہ قلعہ میں رہا ہے۔ جب آصف جاہ نے پانچ تیموری شہزادوں کو قلعہ کے اندر قتل کروایا ہے۔ اُس وقت عالمگیر اور اُس کے دوسرے بھائی سب قلعہ کے اندر ہی تھے۔ شاہجہان ان دنوں دکن

سے آگرہ آپہونچا تھا۔ آصف جاہ شہزادوں کو ہمراہ لے کر آگرہ چلا گیا۔
اس کے بعد جب شاہجہان اپنے بیٹے عالمگیر کے ہاتھوں ۱۰۶۸ھ میں
معزول ہو کر آگرہ کے قلعہ میں نظر بند ہوتا ہے۔ تو عالمگیر اپنے بڑے
بھائی دارا شکوہ کے تعاقب میں لاہور آتا اور قلعہ کی بجائے شالامار باغ
میں مقیم ہوتا ہے۔ جہاں سے ہاتھی پر سوار ہو کر چند گھنٹوں کے لئے
قلعہ میں آتا اور پھر واپس شالامار میں چلا جاتا ہے۔

جلوس سال ششم ۱۰۷۳ھ میں عالمگیر پھر لاہور آیا۔ اور چند یوم قلعہ
میں قیام کر کے ۲۵۔ رمضان کو کشمیر روانہ ہو گیا۔ جہاں سے ۷ صفر ۱۰۷۴ھ
کو چار ماہ گیارہ روز کے بعد پھر مراجعت فرمائے قلعہ لاہور ہوا۔ اور کئی
دن تک قیام پذیر رہا۔ اسی قلعہ میں شاہ عباس والئی ایران کے ایلچی کو
سات لاکھ روپیہ کے تحائف شاہِ ایران کے لئے دیئے گئے۔ اور اپنے
ایک معتمد کے ہاتھ اپنا دستخطی خط شاہِ ایران کے جواب میں ارسال کیا۔
عالمگیر نے قلعہ کی عمارتوں میں کچھ ایزادی بھی کی۔ گو وہ ایزادی شاہجہان
اور جہانگیر کے زمانہ کی عمارتوں کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ البتہ
اورنگ زیب کی چند یادگاریں جو قلعہ کی زینت و رونق کا باعث ہیں۔
قابل ذکر ہیں۔ ایک شاہی مسجد جو قلعہ کے سامنے ہی ہے۔ ایک سرائے
اورنگ زیب کی جس کی نسبت لاہور کی تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ وہ اس
عالیشان شاہی مسجد کے مشرق کی طرف ہے۔ اور بڑی تاریخی اہمیت
رکھتی ہے۔ لیکن آج جس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ تیسری عمارت وہ ہے۔
جو بادشاہی مسجد اور قلعہ کے درمیان جنوب کی طرف دومنزلہ واقع ہے۔
اور جس کے عین درمیان روشنائی دروازہ ہے۔ یہ عمارت درحقیقت ان

طلباء کے لئے جو بادشاہی مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ دار الاقامت کا کام دیتی
تھی۔ عالمگیر کے بعد شاہی خاندان کے لئے یہاں عرق وغیرہ نکالنے کا
کارخانہ جاری ہوا۔ اور یہ عمارت آبدار خانہ کے نام سے موسوم ہوئی۔
مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۹ء تک اس عمارت
کا نام گلاب خانہ مشہور رہا۔ یہاں عرق گلاب اور بید مشک نکالا جاتا تھا
اور مہاراجہ کے لئے قیمتی معجونیں اور ادویات تیار ہوتی تھیں۔ انگریزی
عہد میں یہ عمارت اسی کام کے لئے استعمال ہونے لگی۔ جس کام کے لئے
اورنگ زیب نے اس کو تعمیر کرایا تھا۔ یعنی اب یہاں طلباء رہتے ہیں
عالمگیری عہد کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ گذشتہ سطور میں تم
پڑھ چکے ہو۔ کہ اکبر کے زمانہ میں دریائے راوی قلعہ کی دیواروں کے نیچے
بہتا تھا۔ اور چونکہ روز بروز اس کا رخ شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسلئے
عالمگیر نے اپنے چوتھے سال جلوس میں دوکوس لمبا ایک بند دریا پر بنوا
دیا۔ جس کا نام کتابوں میں بند عالمگیری درج ہے۔ اس سے دریا کا رخ
شاہدرہ کی طرف چلا گیا۔ اور شہر نقصان سے بچ رہا۔ اب بھی اس بند کے
آثار پائے جاتے ہیں۔

شاہ عالم بہادر شاہ ۔ ۲۸۔ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو عالمگیر نے دکن میں
انتقال کیا۔ قریبًا سوا دو مہینے کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ نے بعمر اڑسٹھ
سال صفر ۱۱۱۹ھ کو لاہور کے قلعہ میں خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری
کیا۔ اور اپنے دیوان منعم خاں کو وزارت کی مبارکباد دی۔ اسی قلعہ میں

ف۵ پنجاب اور کابل شہزادوں کی جاگیر میں تھے۔ ملازم لاہور کا دیوان منعم خان تھا۔ جسنے شہزادے
کو عالمگیر کے مرنے کی خبر پہونچائی تھی۔ اور لاہور پہونچنے پر سلطنت و حکومت کی مبارکباد دی تھی۔

جہاں اکبر کے عہد میں فتوحات کے احکام جاری ہوتے ۔علمی و مذہبی مباحثوں
کی سرگرمیاں دماغوں کو روشن کرتیں ۔ جہاں جہانگیر اور شاہجہان کے
زمانہ میں مغلیہ عمارات کے خوشنما نمونے دلوں پر رعب و سطوت پیدا کرتے
تھے ۔ بہادر شاہ کے آخری عہد حکومت ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۰ء میں
کبھی تو یہ حکم ہوتا کہ تمام شہر کے کتے مروا دیئے جائیں ۔ کبھی ارشاد ہوتا ۔
علماء و صلحاء جہاں ملیں ان کو مجبوس و بے عزت کرو ۔ ہندوؤں کو حکم
ہوا ۔کہ سب ڈاڑھی منڈوا دیں ۔ جو رکھیگا وہ سزا کے قابل ہوگا ۔ آخر
اسی قلعہ میں بہادر شاہ خفقان کی شدت سے ۱۹ ۔ محرم کو انتقال کر گیا ۔
اور لاش دہلی روانہ کی گئی ۔

اس کے بعد کسی مغل بادشاہ کو لاہور کا قلعہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا ۔
البتہ مغل گورنراں کی طرف سے لاہور میں حکومت کرتے رہے ۔ کامل
اٹھاسی سال کے بعد ۱۷۹۸ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا ۔
اور قلعہ میں اپنی رہائش اختیار کی ۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اسکے جانشین ۔ رنجیت سنگھ
کی موت سے سولہ سال پیشتر ۱۸۲۳ء میں ولیم مورکرافٹ ایک انگریز
سیاح لاہور آیا ۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں قلعہ اور ثمن برج کے جو حالات
لکھے ہیں ۔ اُن کا کچھ خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔ ثمن برج کی کئی
منزلیں ہیں ۔ اور اس کی دیواروں پر روغنی منقش کام خوب چمکتا ہے ۔
انسانوں اور حیوانوں کی لڑائیاں دیواروں پر ایک عجیب لطف دیتی
ہیں ۔ اس عمارت کا بہت سا حصہ منہدم و مسمار ہو چکا تھا ۔ رنجیت سنگھ
نے اس کی کچھ مرمت کرادی ہے ۔ مگر سکھوں کو فن تعمیر کا وہ اعلےٰ مذاق

حاصل نہیں ہے۔ جو مغلوں کو تھا۔" دسہرہ اور بسنت کے تہواروں پر مہاراجہ کی سواری بڑے تزک و احتشام سے قلعہ سے نکلتی تھی۔ شاہجہانی عہد کی موتی مسجد میں مہاراجہ کے حکم سے خزانہ رکھا گیا۔ اور اس کا نام موتی مندر قرار پایا۔ اسی قلعہ میں مہاراجہ شیر سنگھ کا وزیر راجہ دھیان سنگھ (۱۸۴۳ء) میں سندھانوالیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور اسی قلعہ پر مہاراجہ شیر سنگھ نے ۱۸۴۱ء میں رانی جنداں اور اس کی محصور ڈوگرہ فوج پر بادشاہی مسجد کے میناروں کے ذریعہ توپوں کے فائر کئے۔ اسی قلعہ میں ۱۸۴۹ء میں دنیا کا مشہور کوہ نور ہیرا مہاراجہ دلیپ سنگھ نے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کے سپرد کیا۔ اسی قلعہ سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو نکال کر انگلستان اور رانی جنداں کو بدر کر کے قلعہ شیخوپورہ میں لے گئے۔"

عہد سرکار انگریزی۔ ہاتھی پول دروازہ جو صرف حرم سرا کے لئے مخصوص تھا۔ بادشاہی عہد اور ناظمانِ لاہور اور سکھوں کے عہد میں بھی ہمیشہ بند رہا۔ لیکن انگریزوں نے شرقی اور غربی دونوں بڑے دروازے بند کر دیئے۔ قلعہ کی بے شمار شاہی عمارتیں گرا کر گوروں کے لئے بارکیں بنائی گئیں۔ شیش محل۔ موتی مسجد۔ تخت شاہی۔ دالان محاذ تخت۔ خوابگاہ کلاں و خورد۔ مکانات ثمن برج وغیرہ ابھی تک موجود ہیں سرکار انگریزی بھی ابتدائی ایام میں اپنا خزانہ موتی مسجد ہی میں رکھتی تھی۔ لیکن اب وہ مسجد واگذار ہے۔ قلعہ کی بالائی عمارت کے نیچے اکثر تہ خانے مغلیہ زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ثمن برج کے نیچے بڑا وسیع سرا خانہ ہے جہاں سرکاری شراب کا ذخیرہ بڑے پیمانہ پر جمع رہتا ہے۔

لاہور کا قلعہ ۱۸۴۹ء میں انگریزی فوج کے حوالے کیا گیا تھا۔ کامل

پچھتر سال کے بعد یہ قلعہ ۱۶ جنوری ۱۹۲۴ء کو پھر سول حکام کے حوالہ کیا گیا۔ چنانچہ دس بجے کے قریب نارتھ سیٹن رجمنٹ قلعہ پولیس کے حوالے کر کے خود نئی بارکوں میں چلی گئی۔ اس تبدیلی کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قلعہ مضر صحت جگہ میں واقع ہے۔ اور اس کے ساتھ چھوٹا راوی بہتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ قلعہ چھاونی سے بہت دور ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ قلعہ میں فوج کے لئے جگہ ہی کم ہے۔ قلعہ دیکھنے کے لئے صاحب ڈپٹی کمشنر کے پاس درخواست کرنی پڑتی ہے۔ قلعہ کی دیواروں اور اندرون قلعہ کی عمارات کی مرمت بھی ہوتی رہتی ہے۔ مگر بیرونی دیواریں اب پھر شکستہ اور مرمت طلب ہو رہی ہیں۔ یہ قلعہ بھی دیگر شاہی عمارات کی طرح محکمہ آثار قدیمہ کے ماتحت ہے ٭

تین پنجابی ہم مکتب

نظام الملک طوسی۔ عمر خیام نیشاپوری اور حسن بن صباح کا نام سب اہل علم جانتے ہیں یہ تینوں یگانۂ دہر ہستیاں ایک ہی مکتب میں ایک ہی اُستاد کے پاس زانوئے ادب تہ کرتی رہی ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انتخاب روزگار مذاق طبیعت نے اور بقائے دوام کی خواہش نے نظام الملک کو خاندان سلجوقی[1] کی وزارت کا قلمدان سپرد کیا۔ عمر خیام نے فلسفیانہ شاعری میں وہ نام

---

[1] سلطان الپ ارسلان اور اُس کے بیٹے سلطان ملک شاہ کے جو خارس اور ماوراءالنہر اور عراق و شام کے بادشاہ تھے۔ اور جن کے مقابلہ کا اُس زمانہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا ۲۹ سال تک وزیر رہے ہیں۔ نظام الملک ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۴۸۵ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔ نیشاپور کا مدرسہ نظامیہ اسی کی یادگار ہے ٭

پیدا کیا۔ کہ ایران و ترکستان اور بغداد و افغانستان کے علاوہ ہندو یورپ میں
اس کے مداح پیدا ہو گئے۔ حسن بن صباح نے تو فرقۂ باطنیہ قائم کر کے نہ
صرف طاقت و ثروت حاصل کی۔ بلکہ وہ شاہانہ حیثیت قائم کر لی۔ کہ چار
نسلوں تک اس کی اولاد وسیع مملکت میں بادشاہی کرتی رہی۔

تاریخ ان تینوں نادر روزگار ہم مکتبوں کے عظیم الشان کارناموں سے
بھری ہوئی ہے۔ یہ تینوں ہم مکتب علمائے عصر میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔
علم و فضل میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ نظام الملک نے علوم و فنون کی
سرپرستی۔ اور اپنے قابل ہم جماعت و ہم مکتب عمر خیام کی وہ اعانت کی
ہے۔ کہ تاریخ کے اوراق ورق گل بن کر اس کے نام پر نثار ہو رہے ہیں۔

ایسے عدیم النظیر طالب علم جن میں شہرت و عظمت کے لحاظ سے
ایک وزرائے اسلام کے سلسلہ کی بیش کڑی ہو۔ ایک شاعری میں درجہ
کمال رکھتا ہو۔ اور ایک عروج و اقبال کی انتہائی منزل پر پہونچ چکا ہو۔
ہر روز کہاں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مادرِ گیتی ایسے فرزند بار بار پیدا نہیں کرتی۔
اور نہ اس قسم کی مثالیں ہم کو صفحاتِ تاریخ میں کثرت سے نظر آسکتی ہیں۔

لیکن یہ مشہور مثل کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ خواہ کتنے عرصہ
کے بعد دہرائے۔ آخر کبھی نہ کبھی اپنی صداقت دکھا جاتی ہے۔ چنانچہ ان تین
نادر طالب علموں کے قریباً ساڑھے پانچ سو سال بعد دسویں اور گیارہویں
صدی ہجری میں ہم کو تاریخ پھر تین جلیل القدر ہم مکتبوں کے نام بتاتی ہے
اس مرتبہ یہ ہم مکتب فارس و تاتار کی سرزمین میں نظر نہیں آتے۔ نہ ہم
انہیں نیشاپور، شیراز۔ بغداد۔ آذربائیجان وغیرہ کے خطہ میں دیکھتے ہیں۔
بلکہ یہ تینوں ہم مکتب ہمیں ایسے شہر میں نظر آتے ہیں۔ جس کی زبان عربی

اور ایرانی زبانوں سے کسی صورت میں بھی نہیں ملتی۔ اور نہ یہ کبھی توقع ہو سکتی ہے۔ کہ ایسے ملک اور ایسے شہر میں عربی اور فارسی کے طالب علم ہی نہیں بلکہ علامہ ملک العلماء پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ تینوں ہم مکتب پنجاب میں پیدا ہوئے۔ یہیں پھلے پھولے۔ اور یہیں انہوں نے علم حاصل کیا۔ البتہ ان میں سے ایک دہلی میں پیوندِ خاک ہوا۔ اور دو اپنے مسکنوں میں راہگذرِ عالم جاودانی ہوئے۔ ایک طالب علم کا نام ملک العلماء علامہ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی ہے۔ دوسرے کا نام نواب سعد اللہ خاں چنیوٹی ہے۔ تیسرے جلیل القدر طالب علم کا نام شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہے۔ ان تینوں ہم مکتبوں نے لاہور و سیالکوٹ کے مدارس میں علامہ کمال کاشمیری سے حدیث و تفسیر منطق و فلسفہ اور علم کلام کی تعلیم اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔ جب دسویں صدی ہجری کو اپنی یک صد طویل منزلوں میں سے صرف دس بارہ منزلیں طے کرنی باقی رہ گئی تھیں۔ تینوں ہم مکتبوں نے لازوال شہرت حاصل کی ہے۔ نہ صرف تاریخوں میں بلکہ دلوں پر اور زبانوں پر ان ممتاز و برگزیدہ ہستیوں کے علمی۔ ملکی اور دینی کارناموں کا ذکر ہے۔

مولوی عبدالحکیم اکبر کے عہد میں لاہور کی سرکاری درسگاہ کے مدرس اعلیٰ (پرنسپل) مقرر ہوتے ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں ان کو جاگیر بطور مدد معاش ملتی ہے۔ اور بادشاہ کی مصاحبت کی عزت حاصل ہوتی ہے۔ شاہجہان کے زمانہ میں علامہ ممدوح دو مرتبہ ہموزن روپیہ کے ساتھ تولے جاتے ہیں۔ اور ان کی جاگیر رفتہ رفتہ سوا لاکھ روپیہ سالانہ تک پہونچا دی جاتی ہے۔ آپ کے

ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی سوانح عمری علیحدہ چھپ چکی ہے۔ قیمت ۱۲/

دم قدم سے سیالکوٹ میں علوم و فنون کی وہ رونق اور درسگاہ عبد الحکیم پہ ہیں تشنگانِ علم کی وہ بھیڑ ہوتی ہے۔ کہ سیالکوٹ پر ایک علمی یونیورسٹی ہونیکا شبہ ہوتا ہے۔ مولوی عبد الحکیم ۱۰۶۸ھ میں ٹھیک اسی سال جب اُن کے حقیقی قدردان و مربی شاہجہان کو اُس کے بیٹے عالمگیر نے نظر بند کیا ہے۔ اپنے وطن سیالکوٹ میں انتقال کر جاتے ہیں ؛

ملک العلماء عبد الحکیم کی تصانیف زیادہ تر علم منطق، فلسفہ اور کلام میں مشہور ہیں۔ انہوں نے منطق و کلام کی کتابوں پر بسیط حواشی لکھے ہیں اِن کی تصانیف نہ صرف ہندوستان کی علمی درسگاہوں میں بلکہ مراکش و بخارا۔ کابل و قسطنطنیہ اور مصر و شام تک طلبا کو پڑھائی جاتی ہیں نہ صرف سیالکوٹ اور پنجاب بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس جید عالم کی مبارک ذات پر فخر ہے ؛

ان کا دوسرا ہم مکتب سعد اللہ خاں چنیوٹ کا رہنے والا ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ لاہور اور سیالکوٹ میں علامہ کمال کاشمیری کی درسگاہوں میں دن کو آفتاب کی روشنی میں اور رات کو مٹی کے چراغ میں سرسوں کا نہیں بلکہ آنکھوں کا تیل جلا کر علم کی پیاس بجھاتا تھا ؛

بعض تذکروں اور تاریخوں میں درج ہے۔ کہ علمائے عصر میں ملا سعد اللہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کسی سے کم نہ تھا۔ ۱۰۴۵ھ کے قریب جب شاہجہان تک اس کی قابلیت کی شہرت پہونچی۔ تو اس نے سعد اللہ کو بلایا۔ لیکن جب اسے تنخواہ حسب خواہش نہ ملی۔ تو بادشاہ کی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہ کر کے واپس چلا آیا۔ بادشاہ پر اس کی قابلیت و علمیت نقش ہو چکی تھی۔ اس لئے ۱۰۵۰ھ میں پھر یاد کیا۔ اور اسے معقول مشاہرہ دیا۔ چار ہی سال کے

اندر یعنی ۱۰۵۴ھ میں ملا سعد اللہ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم صاحبقران ثانی کے نام سے مخاطب ہونے لگا۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب ملا اور اس کے بعد روز بروز اعزاز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شاہزادہ دارا شکوہ جو شاہجہان کا لاڈلہ بیٹا اور اُس کا ولیعہد تھا۔ اس سے خم کھاتا تھا۔

سعد اللہ خاں نے لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑ کر ۱۰۶۶ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔

مولانا عبدالحکیم کے تیسرے جلیل القدر اور لاثانی ہم مکتب حضرت شیخ احمد سرہندی تھے۔ جو زمانہ اکبر ۹۷۱ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ نے فارغ التحصیل ہو کر ابوالفضل اور فیضی سے آگرہ میں جا کر طویل اور زبردست بحثیں کی ہیں۔ یہ دونو بھائی جن میں ایک اکبر کا وزیر اور دوسرا دربار کا ملک الشعرا تھا۔ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی مذہبی لحاظ سے بالکل آزاد منش تھے۔ بلکہ اکبر کو لامذہبی کی چاٹ بھی انہی دونوں بھائیوں نے لگائی تھی۔ اس لئے علمائے اسلام اور خصوصاً امام غزالی رح کو یہ دونوں بھائی بہت بُرا سمجھتے تھے۔ علمائے دربار اپنی مصلحتوں کیوجہ سے خاموش تھے۔ مگر حضرت شیخ احمد سرہندی بادشاہ اور وزیر دونوں کے عیوب و نقائص برملا ظاہر کرتے تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں آپ کے پاس ارادتمندوں اور حق کے طالبوں کا ایک جم غفیر رہتا تھا۔ حاسدوں نے آپ کے خیالات کو اُلٹ پلٹ کر بادشاہ کے روبرو ایسے الفاظ میں بیان کیا۔ کہ بادشاہ ان سے بدظن ہو گیا۔ اور ان کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد نہ صرف اُن کو رہا کر دیا۔ بلکہ معافی مانگی۔ اور حضرت کے ایماء کے مطابق احیائے سنت کے احکام جاری کئے۔ علامہ

عبدالحکیم نے آپ کو نہ صرف مجدد الف ثانی کا خطاب دیا بلکہ حضرت کی بیعت بھی کی۔ ۱۰۳۴ھ میں آپ انتقال فرما گئے۔ آپ شہرت و عظمت کے لحاظ سے اپنے دونوں جلیل القدر ہم مکتبوں سے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کی زندگی ہی میں اکثر شاہزادے بلکہ بیرونی ممالک کے بادشاہ بھی آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے تھے۔ طریقہ مجددیہ احمدیہ جو اتباع شریعت و احیائے سنت کے لحاظ سے صوفیائے کرام کے تمام سلسلوں سے افضل و برتر ہے۔ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کا روضہ سرہند میں مرجع خلائق ہے۔

جس طرح اہل سلجوقیہ کے تینوں عظیم القدر ہم مکتب آسمان شہرت پر روشن ستارے بن کر چمکے ہیں۔ اسی طرح عہد مغلیہ کے یہ تینوں رفیع المنزلت ہم مکتب بقائے دوام کا خلعت حاصل کر کے زبانِ خاموش سے کہہ رہے ہیں۔

؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نورجہاں کی آخری خوابگاہ

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

نورجہاں کو جانتے ہو۔ کس جنگل بیابان کس زمانہ مصیبت افزا اور کس پریشان حالی و غریب الوطنی میں پیدا ہوئی۔ پھر کہاں پرورش پائی اور کس طرح پھلی پھولی۔ وہ باپ جس کو اس عالم میں اس کی پیدائش بار گراں معلوم ہوئی تھی۔ آخر اسی کی بدولت اعتماد الدولہ اور "دیوان بیوتات" ہوا۔ وہ ماں

جس نے پیدا ہوتے ہی اپنی چھاتی سے الگ کر کے لوہے کا دل کر لیا تھا۔
اسی سنگِ پارس اور اسی لعل بے بہا کی بدولت جواہرات اور ہیروں کی
مالک ہو گئی۔

پھر یہ بھی جانتے ہو۔ وہ جنگل کی پیدائش کس طرح مہرالنسا سے نورمحل
اور نورمحل سے نورجہاں اور آخر میں جہانگیر یعنی سلطنت کی مختارِ کل بنگئی۔
کیسے کیسے جلیل القدر امراء بلکہ امیرالامراء اس کی سرکار کے ادنےٰ غلام تھے۔
کتنے شعراء اور اہلِ علم تھے۔ جو اُس کے دامن سے لپٹے رہتے تھے۔ کیسی
کیسی عالیشان عمارتیں اس کے حکم اور اس کی تحریک سے دہلی۔ آگرہ۔ لاہور
کشمیر اور کابل میں تعمیر ہوئیں۔ کس قدر مقبرے اور مزار اس نے مرمت اور تعمیر
کرائے۔ آؤ آج تمہیں بتائیں۔ اس کی اپنی آخری خوابگاہ کس حال میں ہے

نورجہاں لاہور میں جہاں وہ اپنے خاوند[1] کی وفات کے بعد مرتے دم
تک اقامت گزیں رہی۔ ۲۹۔ شوال سنہ ۱۰۵۵ھ کو انتقال کر گئی۔ اور
اپنے بھائی یمین الدولہ آصف جاہ[2] کے مقبرہ کے پہلو میں دفن ہوئی۔ مزار
نورجہاں کی جو کیفیت ظفرنامہ شاہجہان[3] میں شاہجہان نامہ کے حوالہ سے
درج ہے۔ پہلے اس کو بالاختصار لکھتا ہوں۔ پھر سلطنت کے انقلاب کے

[1] جہانگیر وفات سنہ ۱۰۳۷ھ [2] وفات سنہ ۱۰۵۱ھ شاہجہان کا وزیر تھا [3] تاریخ ہند مولوی ذکاءاللہ کی جلد ہفتم مطبوعہ سنہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۲۸ و ۳۲۷ [4] اس کا نام عمل صالح بھی ہے۔ مصنف محمد صالح کمبوہ مسکن و مدفن لاہور۔ اس کی تعمیر کردہ ایک مسجد موچی دروازہ لاہور میں اب تک موجود ہے۔ یہ مصنف جہانگیر کے زمانہ سے لیکر عالمگیر کی ابتدائی حکومت تک زندہ رہا ہے۔ شاہجہان نامہ میں شاہجہان کا حال پیدائش سے وفات تک مفصل درج ہے۔ نورجہاں نے محمد صالح کی زندگی ہی میں وفات پائی ہے +

بدزمانہ کے بے دردہاتھوں اور نااہل حکمرانوں کی سنگدلی و شقاوت قلبی نے ملکۂ ہند کی سلطنت کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس کا کچھ ذکر کرونگا ظفر نامہ میں لکھا ہے "یہ مقبرہ روضۂ جہانگیر کے جلوہ خانہ کے غرب میں واقع ہے۔ اس کا گنبد سطح سے بلندی تک مثمن ہے۔ قطر اس کا پندرہ گز اضلاع ہشتگانہ۔ اندر کی طرف آٹھ نشیمن اور باہر کی طرف آٹھ پیش طاق۔ ہر طاق طول میں سات عرض میں چار اور ارتفاع میں گیارہ گز۔ بطرز نیم ہشت۔ عمارت کے اندر سنگ مرمر کا فرش اور باہر سنگ ابری سنگ مرمر۔ سنگ زرد اور طرح طرح کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔

مقبرہ کے بلند چبوترہ اور قبر کی اندر کی عمارت میں انواع و اقسام کے رنگین پتھروں سے پرچین کاری کی گئی ہے۔ آیات قرآنی اور اسمائے الٰہی بہ طریق پرچین کاری اس میں منقش ہیں۔ عمارت کے اندر جو فرش ہے۔ اس میں قسم قسم کے خوبصورت پتھر گرہ بندی کر کے لگائے گئے ہیں۔ گنبد کے گردا گرد مثمن چبوترہ ہے۔ اس کا قطر ساٹھ گز ہے۔ اور وہ سرتا پا سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا طول نو اور عرض ساڑھے سات گز ہے۔ یہ مقبرہ نورجہاں نے اپنی حین حیات ہی میں بنوالیا تھا۔ مقبرہ کے چاروں طرف باغات ہیں۔ اور ان کو

لہ تاریخ محمد شاہی میں جس کا دوسرا نام تاریخ نادر الزمانی ہے ۱۰۵۵ھ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "دریں تاریخ نورجہاں بیگم از تنگنائے عالم فانی رحلت نمودہ در مقبرہ کہ پہلوئے مرقدے یمین الدولہ در حین حیات خود بنا نہادہ بود مدفون گشت" صفحہ ۱۹۲۔ یہ تاریخ منشی خوشحالچند سامی کی تصنیف ہے۔ جو فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں دبیر الانشاء رہا ہے۔ تاریخ ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ قلمی نسخہ صفحہ ۱۹۲

"چار چمن" کہتے ہیں۔ چنانچہ چار چمن کے عین وسط میں یہ مقبرہ ہے۔ ہر چمن کا طول و عرض سو سو گز ہے۔ مقبرہ کی شرقی دیوار روضۂ جہانگیر سے مشترک ہے۔ اس مقبرہ کے ضلع غربی میں ایک مسجد ہے۔ اور اس کے شرق میں ایک ایسی خوبصورت عمارت ہے۔ جو مسجد تو نہیں ہے لیکن بالکل مسجد کی طرز پر بنی ہوئی ہے باغ کے جنوب کی سمت ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ یہ تمام عمارت خود نورجہاں نے تین لاکھ روپیہ کی لاگت اور چار سال کی طویل مدت میں تعمیر کرائی تھی۔

نورجہاں نے روح کے اس خلوت کدہ اور لاش کی اس آرامگاہ کو گنج عافیت سمجھ کر تعمیر کرایا تھا۔ اور زبانِ حال سے اس کو خطاب کر کے کہا تھا

اے لحد اے قبر اے خلوت گہ روحِ رواں زیست کی واماندگی کا ایک گہوارہ ہے تو
تیرے ہر گوشہ میں ہیں موجود سامانِ اماں منظرِ ہستی کا اک خاموش نظارہ ہے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴) غیر مطبوعہ اور قلمی ہے۔ اور پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے اس تاریخ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نورجہاں نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ تحقیقات چشتی کا مصنف جس نے سکھ سلطنت کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے صفحہ ۷۶۹ پر لکھتا ہے۔ اس مقبرہ کے نواح میں بہت بڑا باغ تھا۔ اب وہاں زراعت ہوتی ہے۔ یہ ۱۸۶۴ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے آج ۱۹۲۳ء میں زراعت کا نام بھی نہیں ہے۔ نشیب و فراز زمین ہے اور کھجوروں کے چند درخت ہیں یا یہ غالباً وہ دیوار ہے جو مقبرہ آصف جاہ کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقبرہ نورجہاں کی حدود کتنی وسیع تھیں۔ اس دروازہ کا کہیں نام بھی نہیں بلکہ مقبرہ کے گرد کوئی چاردیواری ہی نہیں ہے۔ اور یہ بات کبھی ذہن نشین نہیں ہو سکتی ہے کہ اس مقبرہ کا کوئی عالیشان دروازہ تھا۔

کہتے ہیں "ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را" لیکن یہ علم و فضل کی ملکہ یہ حُسن و زینت کی کان جو مُلکی و علمی دانشوری کا تاج پہنے شاہ و امراء تو کیا "شہنشاہ" کے دل پر حکمران تھی۔ گوشۂ تنہائی میں رہنے کے باوجود بھی آفتوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ کفن چور اور مزار شکن نامرد لٹیرے حاکموں نے اس کی لوح مزار تک بھی اُڑا لی۔ جہاں سنگ مرمر اور سنگِ ابری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جہاں گل و گلزار کی بہار تھی۔ وہاں سنگ و خشت کا ڈھیر ہے اور خشک سخت اور ناہموار خاک چاروں طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ سیاح آتے ہیں۔ مقبرہ کی عبرتناک حالت اور باغ کو بے نام و نشان دیکھ کر حسرت بھرے دل سے کہتے ہیں ؎

تیری حالت سے نمایاں ہے پریشانی تری — کیا کسی ناشاد کا برباد گشتہ دل ہے تو
منظرِ عبرت ہے یہ خاموش ویرانی تری — عالم فانی کی اُک اُجڑی ہوئی محفل ہے تو

جب تک شاہی حکومت رہی۔ اسلامی عمارات اور مغلیہ یادگاروں کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ مگر جب شاہانِ دہلی کی غفلتوں وزرائے دربار کی خود غرضیوں بالخصوص نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں نے سلطنتِ مغلیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ تو لٹیروں اور ڈاکوؤں نے جھاڑیوں اور جنگلوں سے سر نکالا۔ اور نہ صرف حکومت ہی کو پامال کیا۔ بلکہ ان سورماؤں نے اسلامی عمارتوں مسجدوں، مقبروں اور باغوں کو تہس نہس[1] کر دیا۔ اور انہی میں ملکۂ ہند نور جہاں کا مزار بھی تھا جس کی عظمت و سطوت کا سکہ آج بھی تاریخ ہند کے صفحات پر موجود ہے۔ اور جو راوی کے کنارے ایک ٹوٹا پھوٹا بارہ دری

---

[1] بعہد حبا کلال ۱۷۶۵ء و بعہد سہ حاکمانِ لاہور ۱۷۹۹ء و بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بعد از ۱۸۰۰ء تا اختتام حکومت سکھاں ۔

نیچے موت کے ساتھ گلے مل کر سو رہی ہے ٭

سنہ ۱۹۰۵ء سے پیشتر راقم الحروف نے اس مقبرہ حسرت نما کی جو حالت دیکھی ہے۔ اس کی عبرت انگیز کیفیت سے انسان تو انسان صحرا بھی حسرتناک ہوجاتا تھا۔ جن باتوں کا ذکر سنہ ۱۰۵۵ھ کا مصنف (محمد صالح کمبوہ مصنف شاہجہان نامہ) اپنی تاریخ میں بڑے پُرشکوہ الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ سنہ ۱۳۲۳ھ میں خواب و خیال نظر آتی ہیں۔ مقبرہ کے زرین اور مینا کار کمرے۔ چار چمن اُس کی کھلی اور پُربہار روشیں لوحِ مزار اور اُس پر آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی۔ سنگِ مرمر اور سنگِ ابری کے فرش اور ان کے درمیان انواع و اقسام کے پتھروں کی گرہ بندیاں۔ پچی کاری کے نقش۔ حوض۔ فوارے۔ باغ اور مقبرہ کا دروازہ غرض کسی چیز کا نشان کیا نام بھی نہیں ہے ٭

جس مقبرہ اور باغ کی دیواریں روضۂ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے ساتھ مشترک نہیں۔ اور جن کے کچھ نہ کچھ آثار تلاش کرنے سے اُس وقت بھی مل سکتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ریلوے لائن نے اُس مقبرہ کو بھائی اور خاوند کے مقبروں سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ اب وہ ہے اور عالم تنہائی۔ چراغِ گور کی بجائے کرمک شب تاب کبھی کبھی اپنی چمک دمک دکھا جاتا ہے۔ پھول چڑھانے والے کہاں! موجِ ہوا گلِ افسردہ کا پتہ کبھی کبھی اُڑتے اُڑاتے لے آتی ہے۔ اور اس پر بھی دامنِ گرد سے آواز آتی ہے کہ

[1] لاہور میں سب سے پہلے سنہ ۱۸۵۹ء میں ریلوے کارخانہ بنا۔ اور سنہ ۱۸۶۲ء میں لاہور سے امرت سر تک ریل جاری ہوئی۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پشاور لائن تیار ہوئی۔ جس پر نورجہاں کا مقبرہ لاہور سے ۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ٭

آہستہ برگِ گُل بفشاں بر مزارِ ما — بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

بعہد لارڈ کرزن ۱۹۰۵ء میں یا اس سے ایک دو سال پیشتر مہاراجہ بردوان کہ ان کے آبا و اجداد کا اصل وطن لاہور ہی ہے۔ لاہور آئے۔ اور شالامار باغ اور عمارات شاہی کے بعد ملکۂ ہند کے پُر حسرت مزار پر جب ایک نظر ڈالی تو دل پکڑ کر رہ گئے۔ گورنمنٹ پنجاب کو اس طرف توجہ دلائی اور مرمت کے لئے پانچ ہزار روپیہ اپنی گرہ سے بھی دیا۔ چنانچہ اب یہ عمارت گورنمنٹ کے محکمہ آثار قدیمہ میں داخل ہے۔ مقبرہ کے گرد تاروں کا ایک جنگلہ ہے۔ اور چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سرسبز و شاداب روشیں بنا کر چار چمن کی یاد تازہ کر دی گئی ہے۔ گو وہ نام اور آیاتِ قرآنی تو لوحِ مزار پر نہیں لکھے جا سکے۔ لیکن قبر کا تعویذ اور چبوترہ سنگ مرمر کا بنا دیا گیا ہے۔ اس چبوترہ پر دو قبریں ہیں۔ ایک ملکۂ ہند نور جہاں کی اور ایک اس کی بیٹی کی جو شہریار کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ قبروں کے پاس ہی شرقی دیوار کے ساتھ حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی کی طرف سے سنگِ مرمر کی ایک لوح نصب ہے۔ جس پر ذیل کی عبارت معہ نور جہاں کی وفات کے قطعہ تاریخ کے درج ہے۔

پس از فراق دو ہشت سال شد بیک جا — رواں مہر نساء بیگم و ملک بہ جناں
چو یاد بانوئے ہندوستاں سرودم گفت — سنین ہجرت و تاریخ عیسوی تواناں
ہزار و ہفدہ و پنج رفتہ از ہجرت — بلے بہ پیشِ جہانگیر رفتہ نور جہاں

(حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں در سنہ ۱۹۱۲ء مطابق سنہ ۱۳۳۰ھ
ایں لوح را نصب کردند)

جنوب کی طرف ایک تہ خانہ ہے۔ جس میں ایک تو سیڑھیاں اور راستہ

نیچے جانے کا ہے۔ اور شمال جنوب اور مشرق کی طرف سے جالیوں کے ذریعہ بیرونی سطح سے روشنی آتی ہے۔ اصل قبریں اسی تہ خانہ کے اندر تھیں۔ جب آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر اُتار اگیا۔ تو بیدردوں نے عورت زاد کے مقبرہ کی طرف بھی رُخ کیا۔ سنگِ مرمر۔ سنگ سُرخ۔ سنگ ابری سب اُتار لیا۔ تہ خانہ کا دروازہ بند رہتا تھا۔ اس کو بھی کسی دفینہ کی تلاش کے لیئے توڑ ڈالا۔ وہاں کیا تھا۔ دو آبنوسی صندوق ماں بیٹیوں کی لاشوں کو جھانتوں سے لگائے ہوئے سنگین لحدوں میں محفوظ تھے۔ ظالموں نے صندوقوں کو باہر نکالا۔ پتھروں کو اُکھیڑ لیا۔ اور پھر صندوقوں کو زمین میں دفن کر کے اوپر سے سطح برابر کردی اور تہ خانہ کا دروازہ جس کو توڑ ڈالا تھا۔ وہ بھی تعمیر نہ کیا۔

مہاراجہ بردوان کی حب الوطنی سیرکار کی توجہ اور نگرانی اور حاذق الملک بہادر کی نیک یادگار سے مقبرہ کی وہ ذلت و رسوائی اب نہیں ہے۔ جو ۱۹۰۵ء سے پیشتر تھی۔ اب نگرانی و حفاظت اور مزار ملکۂ ہند کی جاروب کشی کے لئے ایک سرکاری آدمی موجود رہتا ہے۔

مقبرۂ نورجہاں کے متصل ہی بر لبِ سڑک مغرب کیجانب تھانہ شاہدرہ کے پاس تحصیل شاہدرہ کی عمارت بھی بن گئی ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ اور جن کو معلوم ہے۔ کہ اس بارہ دری میں ملکۂ ہند دفن ہے۔ وہ اس آسودۂ آغوش راوی کو خطاب کر کے کہتے ہیں

ہے نازاں ہند تجھ پر نازشِ ہندوستان تو ہے
نہیں کچھ ہند ہی پر منحصر نورجہاں تو ہے
جہاں اک پیکرِ بے جاں ہے اس پیکر میں جاں تو ہے
جہاں اک آسماں ہے آفتابِ آسماں تو ہے

ترا مہر تجلّے نور بخش چشمِ انجم ہے
ترا دریائے حسن اک محشرستانِ تلاطم ہے
لگی ہے چُپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے
تری خاموشیٔ مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے
تو زیرِ خاک ہو کر بھی زیارت گاہ دنیا ہے
شکستہ قبر تیری کعبۂ چشمِ تماشا ہے
زمینِ شاہدرہ تو ہے حریفِ چرخِ مینائی
کہ تجھ میں دفن ہے ہندوستاں کی کشور آرائی

بُدھو کا آوا و مقبرہ

بدھو کا آوا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اینٹوں کے بنانے اور پکانے کا ایک کارخانہ یا بھٹہ تھا۔ لیکن تاریخ لاہور میں اس بزادہ یا آوا کو بہت عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ اور بانیٔ بزاوہ بُدھو کے مقبرے کی شاہجہانی عمارت نے اس کو بہت شہرت دے رکھی ہے

عہد حاضرہ میں آوا چونکہ مٹ مٹا کر ایک صاف میدان ہو گیا ہے۔ جہاں مسلمانوں اور عیسائیوں نے اب وسیع قبرستان بنائے ہیں۔ اس لئے لبطور یادگار اس کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بزادہ لاہور سے مشرق کی جانب تین میل کے فاصلہ پر لب سڑک شالامار باغ واقع ہے۔ عہد جہانگیری میں بدھو نام کا ایک کمہار گذرا ہے۔ اس زمانہ میں امراء و وزراء اور بڑے بڑے لوگ بیرون لاہور عالیشان

عمارتیں اور باغات تعمیر کیا کرتے تھے۔ بدھو نے اسی مقام پر جہاں بدھو کے آدے کو شہرت رہی ہے۔ چھوٹا سا پژاوہ تیار کیا۔ اور اینٹیں پکانے کا کام کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا کام یہاں تک بڑھا۔ کہ بقولِ صاحب تحقیقات چشتی وہ اپنے وقت کا میاں سلطان بن گیا۔

بدھو اسی کا بیٹا تھا۔ شاہجہان نے جب شالا باغ کے تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ تو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں نے بدھو کو اینٹوں کا ٹھیکہ دیدیا۔ اس ٹھیکہ اور سرکاری کام کی کثرت اور حکام کی عنایات سے بدھو کا نام سرکاری کاغذات میں "شاہی خشت پز" لکھا جاتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ حضرت میاں میرؒ کے ایک درویش دل ریش سردی اور بارش کی وجہ سے اس پژاوہ پر آنکلے۔ بدھو کے ملازموں نے اس درویش کی حالت دیکھ کر اس سے استہزا بھی کیا۔ اور اس کو ٹھہرنے کے لئے جگہ بھی نہ دی۔ بدھو کی عقل پر بھی شاہی خشت پز ہونے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے بھی طیش میں آکر کہا۔ اس پاگل کو جوتے مار کر نکال دو۔ اس کے ملازمان بداندیش نے فوراً تعمیل کی۔ اور وہ درویش سینہ ریش شدت بارش

لے میاں محمد سلطان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں کشمیر سے لاہور آیا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ میں وہ ایک عمدہ پہلوان تھا۔ پھر اس نے کئی کام شروع کئے۔ اور سب میں ترقی کرتا گیا۔ انگریزوں کے عہد میں اس نے بہت سی پرانی عماروں کی اینٹیں نکالی اور فروخت کی ہیں۔ وہ بہت بڑا رئیس اور ٹھیکیدار تھا۔ اس کی تعمیرات میں سرائے محمد سلطان حویلی میاں سلطان۔ لنڈا بازار اور کئی مسجدیں اور مقبرے ابھی تک موجود ہیں۔ قریباً پچاس سال سے اس کا انتقال ہو چکا ہے۔

بھی ہمیں یہاں سے نکال دیا گیا۔

اُدھر خدا کی قدرت کا ظہور اس طرح ہوا۔ کہ خس و خاشاک اور کوڑا کرکٹ کے ہزار لعل من صرف ہو گئے۔ مگر اینٹیں پختہ ہونے میں نہ آئیں۔ بدھو اسی غم میں بیمار ہو گیا۔ رات کو اس نے اپنے باپ سدھو کو خواب میں دیکھا جو غم و غصہ کی حالت میں اس کو کہہ رہا تھا۔ اگر تو اپنی بہتری چاہتا ہے۔ تو اس فقیر سے اپنی تقصیر معاف کرا۔

بدھو نے تلاش شروع کی۔ آخر معلوم ہوا۔ کہ وہ حضرت میاں میرؒ کے سلسلہ کے عبدالحق نام ایک درویش ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ پاؤں پر گر پڑا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔ حقیقی فقرا تو وہ لوگ ہیں۔ جنکی نسبت ذیل کا شعر صادق آتا ہے ؎

بدلے گالی کے دعائیں فقرا دیتے ہیں
ہائے یہ لوگ بھی کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں ذوقؔ

فرمایا جاؤ خدا نے چاہا تو تمہاری نیم پختہ اینٹیں بھی پختہ اینٹوں کے نرخ پر فروخت ہو جائینگی۔ چنانچہ انہی دنوں میں چند ایک امیر کبیر اُدیبوں نے اپنی تعمیرات کا کام شروع کر دیا۔ اور بدھو کی تمام اینٹیں فروخت ہو گئیں۔[1]

بدھو نے فقیر عبدالحق کا روضہ ان کے انتقال ۱۰۸۲ھ کے بعد بعہد عالمگیر بند بہادر خاں کے شمال کیطرف تعمیر کرایا۔ بدھو کا اپنا مقبرہ بھی اسی جگہ برلب سڑک شالامار باغ ریلوے جنرل سٹور کی شمالی دیوار کے پاس واقع ہے۔

---

[1] تحقیقات چشتی صفحہ ۱۶۷

تیرہ چودہ سال سے ریلوے جنرل سٹور کی وسیع و طویل عمارت لے جو کئی میل تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اور مغلپورہ کے جدید ریلوے سٹیشن نے بہت سی شاہجہانی طرز کی عمارتیں اپنے احاطہ میں لے لی ہیں ۔ انہی میں گنبد بہادر خاں اور ڈیوڑھی مقبرہ نواب علی مردان خاں بھی ہیں ۔ لیکن بدھو کا مزار اس سٹور کی دستبرد سے بچ رہا ہے ۔ یہ شاہجہانی عہد کا گنبد دور ہی سے نظر آتا ہے اس پر کسی قطعہ تاریخ یا صاحب مزار کے نام کا اندراج نہیں ہے ۔ تاریخ نے اس مقبرے اور اس کے گرد و نواح کے جو آثار بتائے یا ان سے پتہ چلا یا ان لوگوں سے جو ان اطراف میں رہتے ہیں ۔ مثلاً قبرستان بدھو کا آوا کے گورکن اور حضرت ایشان کے روضہ کے لوگ ۔ گنبد کی شمالی محراب پر ایک تختی صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور کی طرف سے اس مضمون کی چسپاں ہے جس پر ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء کا تحریر شدہ یہ حکم درج ہے " اس مقبرہ کو خراب کرنے والے کے ساتھ قانونی سلوک کیا جائیگا ۔ جرمانہ یا قید یا دونوں سزائیں دیجائینگی "

اس منقش چینی کار گنبد کے اندر دو قبریں ہیں ۔ مشرقی جانب کی قبر ذرا بلند ہے اور غربی جانب کی چھوٹی ہے ۔ رنگین پچیکاری کا کام گو بہت کچھ مٹ گیا ہے ۔ تاہم اس کی پامالی و خستہ حالی میں اس کی عظمت گذشتہ نظر آرہی ہے ۔ چاروں محرابوں پر جو کھلی رہتی ہیں ۔ اس اعلیٰ کاریگری کے نشان اب تک پائے جاتے ہیں ۔ جو کاسنی اور گلابی خطوط کی لکیروں اور ان رنگوں کے بیل بوٹوں سے ظاہر ہو رہی ہے ۔ مقبرہ کا بیرونی شکستہ چبوترہ چاروں طرف سے پندرہ پندرہ قدم لمبا ہے ۔ مقبرہ کے دریچوں کے اوپر جو عمارت چاروں طرف بڑھی ہوئی ہے ۔ وہ بالکل گر گئی ہے ۔ مقبرہ

شاہ آٹھ ذکر بیر کے) درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ جو اس کے شکستہ چبوترہ پر اُگے
ہوئے ہیں۔ اس گنبد سے قریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلہ پر مشرق کی
طرف ایک پرانا کنواں شکستہ و تباہ حالت میں موجود ہے۔ جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ مقبرہ کے گرد بہت کھلی جگہ تھی۔ مقبرہ کا قدیم دروازہ سڑک
شالامار باغ کے رُخ پر ہے۔ چنانچہ ایک طویل چبوترہ کے نشانات اب
تک نظر آرہے ہیں۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور میں امراء وزراء نے بہت کم عمارتیں تعمیر کرائی
ہیں۔ اور خود عالمگیر کی عمر کا زیادہ حصہ بھی دکن اور دارالسلطنت کی طرف
ہی بسر ہوا ہے۔ اس لئے گو بدھو کے آوے کی بلندی و رفعت چرخ چہارم
تک پہنچ چکی تھی۔ اور کاروبار کی وجہ سے یہاں کئی لوگوں نے معمولی سی
ایک بستی بھی بنا رکھی تھی۔ مگر جب سلطنت کو جو بدھو کی سرپرست تھی
زوال آنے لگا۔ اور چاروں طرف سے لوٹ مار ہونے لگی۔ تو آوا روز بروز
ویران ہونے لگا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ ۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۹ء میں اس ویران
پژاوہ کا نام پھر تاریخوں میں نظر سے گذرتا ہے۔ مہاراجہ کے یوروپین ملازموں
میں جنرل اومی ٹیبیلی جسے پنجابی "اوی طویلہ صاحب" کہتے تھے۔ ایک لائق
اور ہوشیار اٹالین افسر تھا۔ وہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے پس و پیش لاہور
آیا تھا۔ اور مہاراجہ نے ملکی صیغہ کے بعض اہم امورات اس کے سپرد کئے ہوئے تھے
پژاوہ بدھو کی بلندی تین تین منزل یعنی ۳۲-۳۳ فٹ تک تو راقم الحروف
نے بھی دیکھی ہے۔ اُس زمانہ میں تو یہ اس سے بھی بلند ہوگا۔ پژاوہ کی چوٹی
پر جنرل اومی طویلہ نے ایک عالیشان شاہانہ طرز کی کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔

جسے لوگ عام طور پر بارہ دری کہتے تھے۔ کوٹھی کے ارد گرد دور دور تک جگہ صفا کرائی۔ اور اس کو بیل بوٹوں سے سجا کر چھوٹا شملہ بنا دیا۔ اس مقام پر سپاہ کے پنچ صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اور یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔ اس زمانہ میں اپنی بلندی اور گل و گلزار کی وجہ سے یہ مقام فرحت بخش تصور کیا جاتا تھا۔[1]

جنوری سنہ ۱۸۴۳ء میں جب شہزادہ شیر سنگھ راجہ دھیان سنگھ کے ایما پر اپنی جاگیر بٹالہ سے لاہور آیا۔ تو ۱۴۔ جنوری سنہ ۱۸۴۳ء[2] کو اسی کوٹھی میں معہ اپنے مصاحبین کے اس نے قیام کیا۔ اسی جگہ کل پنچ اور فوج کے افسر جمع ہوئے اسی مقام پر شہزادہ کو پنجاب کا مہاراجہ تسلیم کیا گیا۔ اسی ٹیلہ کے نیچے توپوں کی سلامی سے اہل شہر اور اہل قلعہ کو شیر سنگھ کے مہاراجہ ہونے کی خبر پہنچی۔ اور اسی کوٹھی سے نکل کر مہاراجہ نے رانی جنداں کا قلعہ میں محاصرہ کیا۔ اور آخر فتحیاب ہو گیا۔

جب سندھانوالیاں نے ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ شیر سنگھ اس کے ولیعہد شاہزادہ پرتاپ سنگھ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کو یکے بعد دیگرے ایک ہی دن میں قتل کر دیا۔ تو انہوں نے ڈوگرہ خاندان کو بالکل ملیا میٹ کرنے کے لئے راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے راجہ ہیرا سنگھ اور اس کے بھائی راجہ سوچیت سنگھ کو راجہ دھیان سنگھ کی طرف سے (جو قتل ہو چکا تھا) جعلی پیغام بھیج کر ایک مشورہ کیلئے بلوا بھیجا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے اس وقت

---

[1] تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف صفحہ ۴۲۶ [2] تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف میں ۱۴۔ جنوری کی تاریخ تو صحیح ہے۔ مگر سنہ ۱۸۴۱ء درج ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

بدھو کے آوے پر مقیم تھے۔ جو سردار بلائے گیا تھا اس کے ہمراہ پانچ سو سوار تھے۔ ہر چند ان دونوں کو مہاراجہ اور وزیر کی ہلاکت کا علم نہیں تھا۔ لیکن وہ سواروں کے تیوروں سے پہچان گئے تھے۔ کہ ان کی نیت بخیر نظر نہیں آتی۔ انہوں نے راجہ دھیان سنگھ کی تحریر طلب کی۔ آخر بات بڑھتی گئی۔ اور دونوں فوجوں میں اُسی مقام پر مقابلہ ہوا۔ اور سکھ سوار پسپا ہو کر واپس چلا گیا

جب راجہ ہیرا سنگھ کو حقیقتِ حال کا علم ہوا۔ تو اسی مقام پر اس نے سندھیانوالوں کے خلاف سپاہ خالصہ کے سامنے کھڑے ہو کر دل ہلا دینے والی ایک تقریر کی۔ اور آخر اسی مقام سے بادشاہ اور وزیر کا انتقام لینے کے لئے چالیس ہزار فوج جن میں سکھوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی ایک سو توپوں کے ہمراہ شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ قریباً ستر سال سے یہ عالیشان خوبصورت کوٹھی جہاں ملک کے بادشاہ امراء اور وزراء مسکن گزیں رہے ہیں ستم روزگار کے قہر آلودہ ہاتھوں سے بے نام و نشاں چلی آتی ہے۔ پزاوہ کے پہلو میں مسلمانوں نے اپنا قبرستان بنا لیا۔ اور خشت فروشوں اور کمہاروں نے پزاوہ کھود کھود کر اس میں سے بہت سی جگہ نکال لی۔ راقم الحروف نے جب فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں سب سے پہلی مرتبہ شالامار باغ کی کتاب لکھی۔ تو اُس وقت پزاوہ کا بہت سا حصہ ایک ٹیلہ کی صورت میں موجود تھا۔ لیکن آج وہاں ایک عریض و طویل میدان نظر آتا ہے۔ جہاں عیسائیوں کے مُردوں نے شہر خاموشاں آباد کر رکھا ہے۔ یہ قبرستان ایک وسیع چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ جہاں دو آدمی قبرستان کی نگرانی

---

۱ تاریخ پنجاب صفحہ ۲۶۹ ۲ تحقیقات چشتی میں جو سنہ ۱۸۵۹ء کی تصنیف اور سنہ ۱۸۶۷ء کی مطبوعہ ہے صفحہ ۲۲۶ پر لکھا ہے۔ کہ اب وہ کوٹھی گر گئی ہے۔ اور پزاوہ بطور ٹیلہ کھڑا ہے ؂

اور گل بوٹوں کی آبپاشی کے لیئے ہمیشہ وہاں موجود رہتے ہیں۔
اب نہ کوٹھی ہے نہ آوا۔ البتہ گورنمنٹ نے اتنی مہربانی کر دی ہے کہ مسیحی قبرستان اور مقبرہ بدھو کے درمیان ریلوے جنرل سٹور کی دیوار کے متصل ایک گول سا چبوترہ بنا کر اس پر ایک دیوار چار فٹ کھڑی کی ہے۔ جس پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر کچھ انگریزی عبارت مرقوم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ "نظارہ بدھو کا آوا و کوٹھی جنرل اوی طویلہ" یا بالفاظ دیگر ؏

مرمٹوں کا نشاں ہیں گویا

یہ چبوترہ شالا باغ کو جاتے ہوئے قبرستان بدھو کا آوا سے ذرا آگے دائیں ہاتھ پر آتا ہے۔ اس کے گرد لوہے کی ایک زنجیر لگی ہوئی ہے۔

مقبرہ یمین الدولہ آصف جاہ

میرزا غیاث کو جو بعد میں اعتماد الدولہ ہو گیا تھا۔ نورجہاں کا باپ ہونے کی وجہ سے کون نہیں جانتا۔ اسی باپ کا بیٹا اور اسی بہن کا بھائی "یمین الدولہ" تھا۔ جس کا اصلی نام میرزا ابوالحسن تھا۔ اور جس کو مختلف مراتب و مناصب سے ترقی دے کر جہانگیر نے ۱۰۳۵ھ میں لاہور[1] کا گورنر بنایا۔ اور ہفت ہزاری ہفت ہزار کا منصب اور آصف جاہ کا خطاب دیا تھا۔ یہ وہی عظیم القدر شخص ہے۔ جس نے جہانگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اپنی بہن نورجہاں کو جس کا سکہ اور حکم بادشاہ کے پہلو بہ پہلو چلتا تھا نظر بند کر لیا۔ اور ۲ ربیع الاول

[1] اس زمانہ میں پنجاب کے صوبہ کو صوبۂ لاہور کہتے تھے۔

سنہ ۱۰۳۷ھ کو پانچ تیموری شہزادوں[1] کو لاہور میں ایک دم قتل کر کے ہندوستان کا تاج و تخت اپنے داماد شاہجہان کے لئے خالی کر دیا۔ اور اسی دن لاہور میں شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اس کا جاہ و جلال دیکھنا ہو۔ تو شاہجہان کا وہ خط پڑھو۔ جو اُس نے لاہور میں اپنے معتمد خاص کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اُس کو بھیجا تھا۔ بادشاہ القاب و آداب میں اس کو لکھتا ہے "دانائے رموزِ سلطنت عظمیٰ۔ واقفِ اسرار جلالت کبریٰ۔ سرخیل یکرنگان وفادار۔ سالار بایب جہنان حق گذار۔ کارفرمائے ارباب سیف و قلم۔ مدبر امورِ عالم۔ زبدۂ خواقین عالیشان۔ قدوۂ امرائے بلند مکان۔ عضد الخلافہ۔ یمین الدولہ۔ عموے دانا آصف خان" اسی خط میں بادشاہ میرزا ابوالحسن آصف جاہ کو لکھتے ہیں۔ وہ خلعت جو جلوس کے دن پہنا تھا آپ کے لئے بھیجتا ہوں۔ آپ عمو کو بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ ہم عنایت کرتے ہیں۔ اور بندر لاہری بطریق انعام مرحمت کرتے ہیں۔ آپ اس منصب سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ لیکن سردست ہماری یہ عنائیتیں آپ کو مبارک ہوں[2] رموز دانان تاریخ جانتے ہونگے۔ کہ بادشاہ نے اسی خط کے ذریعہ علاوہ اضافہ منصب وغیرہ کے آپ کو "یمین الدولہ عموے دانا آصف خاں" کے عظیم الشان اور بزرگانہ خطاب بھی مرحمت فرمائے تھے۔

---

[1] یہ شہزادے جہانگیر کے بھتیجے اور شاہجہان کے بھائی اور بھتیجے تھے۔ انہی میں شہریار نورجہاں کا داماد بھی تھا۔ جو شاہجہان کے مقابلہ میں تخت و سلطنت کا حقدار تھا (از ماثر الامراء و ظفر نامہ شاہجہان و خلاصۃ التواریخ) [2] ظفر نامہ شاہجہان و تاریخ ہند ذکاء اللہ کی جلد ہفتم صفحہ ۵۶)

جہانگیر کے انتقال اور شاہجہان کے ابتدائی عہد میں آصف جاہ لاہور اور ملتان دونوں صوبوں کے گورنر تھا۔ جب وہ ۱۰۳۷ھ میں اورنگ زیب شجاع اور دارا شکوہ کو ہمراہ لے کر لاہور سے آگرہ کو روانہ ہوا ہے۔ اور وہاں ۱۲- رجب کو بادشاہ کے جشن قمری میں شامل ہوا ہے۔ تو قدردان بادشاہ نے اس کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا کی۔ اور منصب نہ ہزاری ذات و نہ ہزار سوار دو اسپہ وسہ اسپہ عطا فرمایا۔ یہ وہ عروج و اقتدار تھا۔ کہ آج تک کوئی تیموری امیر اس مرتبہ کو نہیں پہنچا تھا۔

۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں یمین الدولہ کو خان خاناں کا خطاب اور تمام ہندوستان کی سپہ سالاری کا عہدہ عطا ہوا۔ اور وہ مرتے دم تک اسی عہدہ پر رہا۔ یمین الدولہ نے بیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس سال کے عرصہ میں ایک عالیشان حویلی لاہور کے میدان نخاس[1] میں تیار کی تھی۔ بادشاہ جب ۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۳ء میں لاہور آیا۔ تو اس حویلی میں یمین الدولہ نے اس کی دعوت کی۔ اور چھ لاکھ روپیہ نذر پیش کیا۔

۱۰۵۱ھ و ۱۶۴۱ء میں سلطنت کا یہ زبردست ستون صرصر اجل کے ایک ہی جھونکے سے گر پڑا۔ بادشاہ نے بڑا رنج کیا۔ اور اس کے بڑے بیٹے شائستہ خان کو جو صوبہ بہار کا گورنر تھا خلعت خاصہ اور فرمان تسلی بھیجا۔ اور اس کے متوسلین و متعلقین اور اس کے دوسرے بیٹوں اور بیٹیوں اور اس کی بیگم کو بڑے بڑے مراتب اور منصب اور بیش بہا خلعت دیکر ان کی دلجوئی کی۔ نہایت افسوس

[1] میدان نخاس دہلی دروازہ کے باہر تھا۔ جہاں آجکل سرائے میاں سلطان۔ لوہا بازار۔ لنڈا بازار اور شہید گنج واقعہ ہے۔ دارا شکوہ اور اس کے حرم سرا اسی حویلی میں رہتے تھے۔ لنڈا بازار اور مسجد شہید گنج کے درمیان جو جگہ ہے۔ اس کا نام اب تک چوک دارا مشہور ہے

آصف خاں" ۱۰۵۱ھ تاریخ وفات ہے۔ اس کی امارت و دولت کا کچھ شمار نہ تھا۔ مآثر الامرائے میں لکھا ہے" اخراجات و مصارفے کہ در سرکار شش بود بعقل نے گنجد" اس پر بادشاہ اور شاہزادوں اور بیگمات کو پیش کش (نقدی) اور دعوت ہائے پُرتکلف الگ۔ دہلی۔ آگرہ اور کشمیر میں اس کی جائداد اڑھائی کروڑ تک درج رجسٹر ہوئی۔

بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ لاش روضۂ جہانگیر کے غربی جانب دفن کی جائے مقبرہ کے چاروں طرف ایک بلند چاردیواری کے اندر باغ تعمیر کیا جائے۔ اور تربت کا گنبد بلند اور عالیشان ہو۔ جو اس کے نام اور کام کی طرح اس کی یادگار رہے۔

اب اس کے مقبرہ کا حال شروع ہوتا ہے۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے شاہجہان کو تخت پر بٹھایا۔ جو صوبہ پنجاب کا گورنر اور تمام ہندوستان کا سپہ سالار تھا جس کے مال و دولت کا کچھ ٹھکانا نہ تھا جس کی بہن نورجہان جہانگیر کی ملکہ اور بیٹی ممتاز محل شاہجہان کی بیگم تھی۔ اور جس کا بیٹا صوبہ بہار کا گورنر اور باپ جہانگیر کا دیوان ہوتا تھا۔

بادشاہ کے حکم سے یہ مقبرہ تمام و کمال سنگ مرمر کا تیار کیا گیا۔ مقبرہ کے اندر کا فرش۔ باہر چبوترہ کا فرش۔ قبر کا تعویذ۔ حوضوں کے کنارے۔ یہاں تک کہ عالیشان دروازہ کی ڈیوڑھی کا فرش بھی سنگِ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے آٹھ دروازے اور آٹھ دہلیزیں اور باہر غلولوں پر ہر جگہ سنگ سُرخ اور اس کے نیچے اور اوپر کاشی کا کام تھا۔ جب پنجاب کی حکومت بیدردوں کے ہاتھ آئی

ف۔ جلد اول صفحہ ۱۵۵ ئ۔ ۵۔ تاریخ لاہور اردو رائے کنہیا لال و تحقیقات چشتی اردو۔ و تاریخ لاہور انگریزی جج محمد لطیف۔

تو باغ اور مقبرہ کی یہ ڈیوڑھی جو اس گلستان میں گلدستہ صد رنگ تھی۔ وادئ پُرخار میں ایک ویران سا نشان سنگ بن کے رہ گئی۔ ڈیوڑھی دو منزلہ ہے۔ دونوں طرف اُوپر جانے کے لئے ۲۶-۲۶ سیڑھیاں ہیں۔ گرمی کے دن ہوں اور ڈیوڑھی کی دوسری منزل میں نشست گاہ ہو۔ اور وہ شخص وہاں موجود ہو جس کو مبدأ فیاض نے چشم بصیرت دماغ نکتہ رس اور دل دردمند عطا کیا ہو۔ تو معلوم نہیں ہوا کی لطافت و رُوح پروری اور اس عالیشان مگر عبرتناک سر بفلک آخری منزل گاہ کی نزہت پا دینے والی کیفیت اس کے تخیلات کو کہاں سے کہاں پہنچا دے۔

ڈیوڑھی سے مقبرہ تک دو رویہ پختہ خشتی فرش اور درمیان میں چھوٹی سی نہر ہے۔ جو مقبرہ کے گرد کی چاروں چھوٹی چھوٹی شاخوں میں چکر لگاتی ہے۔ مقبرہ میں سونے چاندی کی قندیلیں اور جھاڑ فانوس اور فرش فروش جہانگیر کے مقبرہ سے کم نہ تھے۔ قرآن شریف پڑھنے کے لئے ایک حافظ خانہ اور ایک مطبخ خانہ بھی تھا۔ علاوہ ازیں اور مکانات بھی تھے۔ جن میں چوکیدار اور محافظ وغیرہ رہتے تھے۔ یہ سب عمارتیں پتھر کی طمع سے بیدرد حاکموں نے منہدم کرا دیں اور سونے چاندی کے سامان شیر مادر سمجھ کر لُوٹ لے گئے۔ سہ حاکمان لاہور[1] کا زمانہ خصوصیت کے ساتھ اہلِ لاہور اور شائقینِ سلف کی یادگاروں کیلئے ایک زلزلہ اور طوفان بلکہ قیامت سے کم نہ تھا۔

رنجیت سنگھ کا دور آیا۔ تو اس نے حضوری باغ لاہور کی بارہ دری اور دربار امرتسر کی تعمیر کے لئے کئی اسلامی مقبرے بیخ و بن سے اُکھاڑ دیئے۔ مہاراجہ کے حکم سے اس مقبرۂ عالیشان کا پتھر بھی اُتارا گیا۔ لیکن ایسی بے احتیاطی کیساتھ

---

[1] تاریخ لاہور اردو رائے کنہیا لال صفحہ ۳۲۸

کہ وہ مقبرہ جس میں سونے چاندی کا سامان اور جھاڑ فانوس اور سنگِ مرمر سنگِ سُرخ کا فرش تھا ایک کھنڈر کی طرح نظر آنے لگا۔ مقبرہ میں اوپر جانے کے راستہ پر جو سیڑھیاں تھیں اُن کا پتھر نہایت بیرحمی سے اُکھاڑا گیا۔ مقبرہ کے اندر سنگِ مرمر کا جو فرش تھا۔ اس کو بھی اُکھاڑ کر شہر میں لے آئے معرف قبر کا تعویذ اس لئے سلامت رہ گیا۔ کہ اس پر نوذ نہ نام باری تعالیٰ کے لکھے ہوئے تھے۔ اور وہ ان کے کسی کام نہ آسکتا تھا۔

اس وقت کی حکومت کے اس بیدردانہ سلوک کا ہندو مسلمان مورخوں کے علاوہ اس زمانہ کے انگریز سیاحوں نے بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ولیم مورکرافٹ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں لاہور آیا تھا۔ اور جس کی مہاراجہ نے کمال عزت کی تھی۔ اپنے سفرنامہ میں (صفحہ ۱۰۴ پر) حضوری باغ کی بارہ دری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "مہاراجہ نے حضوری باغ میں جو نشستگاہ بنائی ہے۔ اس میں اور مقبروں کے علاوہ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر بھی اس کے فرش اور گنبد سے اُتار کر لگایا گیا ہے"۔

اس ہشت پہلو مقبرہ کے چبوترہ پر (جس کا فرش سنگِ مرمر کا تھا) جو چار فوارہ دار حوض ہیں۔ اور جن کے کناروں پر سنگِ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ ہشت پہلو نہر جو مقبرہ کے گرد چکر لگاتی ہے۔ ان سے لاہور کے لوگ ایک عرصہ سے لاعلم چلے آتے تھے۔ باغ کی ساری زمین پر قبضہ کرنے کے

ف تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۳۲۸

ف اس باغ کے دو تختہ شاہدرہ کے ایک سکھ خاندان کے قبضہ میں چلے آتے تھے۔ گورنمنٹ نے قابضوں کو معاوضہ دے کر ان دونوں تختوں کو مقبرہ اور باغ کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

بعد جس کو تین چار سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ مٹی کے بڑے بڑے تودوں اور
انباروں کے نیچے نہروں اور حوضوں کے نشان ملے۔ جن کو صاف کرا کر باغ اور
مقبرہ کی رونق و زیبائش میں اضافہ کیا گیا۔ باغ جس کا اندرونی رقبہ تین بیگہ
بیان کیا جاتا ہے۔ نہایت مصفا حالت میں ہے۔ ایک کنواں اسی زمانہ کا
مقبرہ کے مشرق میں بالکل اس کے متصل ہے۔ اور ایک مغربی اور جنوبی گوشہ
میں بیرونی دیوار کے پاس گورنمنٹ پنجاب نے سنہ ۱۸۸۰ء میں رائے کنہیا لال
مولف تاریخ لاہور کی معرفت اس عالیشان مقبرہ کی کچھ مرمت کرائی تھی۔
اور اسی مرمت کا یہ نتیجہ تھا کہ اس مقبرہ کا یہ ہیبتناک گنبد گرنے سے بچ
گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد گورنمنٹ نے اس وقت اس مقبرہ کی خبر لی جب
سنہ ۱۹۰۴ء یا سنہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن وائسرائے و گورنر جنرل کی توجہ سے
آثار قدیمہ کا محکمہ قائم ہو گیا۔ مقبرہ کے گنبد کی سیڑھیاں سنگ سرخ اتار کر
جن پر سے سیڑھیوں کے نشان ہی مٹا دیئے گئے تھے۔ از سر نو مرمت ہوئیں
گنبد دو منزلہ بلکہ سہ منزلہ ہے

سنگ مرمر کا تعویذ جو باری تعالےٰ کے ننانوے ناموں کی وجہ سے بیکار
سمجھ کر ایک طرف پھینکدیا گیا تھا۔ گورنمنٹ کی توجہ سے اب پھر اپنی
اصلی جگہ پر آگیا ہے۔ اس تعویذ پر دو طرف تو باری تعالےٰ کے ننانوے نام
ہیں۔ سرہانے کی طرف "هُوَ اللّٰهُ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ
الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْم۔ اور بالائے تعویذ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ
لکھا ہوا ہے۔ حروف کئی جگہ سے اکھڑ رہے ہیں۔ کاش ان کی پھر درستی ہو سکے۔
مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر ذرا غور سے دیکھو گے۔ تو کہیں کہیں مٹے ہوئے
بکھرے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے سبز۔ زرد اور رنگیلے پتھروں کے قدیم نقش و

نگار نظر آئینگے ۔ مؤلفِ تحقیقاتِ چشتی لکھتا ہے ۔ یہ علامات ان منبّت کار نقش و نگار۔ نگدار زرد و سیاہ پتھروں کی ہیں ۔ جو چند روزہ حکومت کے نشہ میں ابدی لعنت و نفرت حاصل کرنے والوں نے یہاں سے اُتار لئے تھے ۔ مقبرہ کے اندر اور باہر جہاں شاہجہانی زمانہ میں سنگِ مرمر کا فرش تھا ۔ اور یہ حاکمان لاہور اور سکھوں کے عہد میں جہاں ناہموار گھنڈر سے تھے ۔ سرکار انگریزی نے پختہ چونہ گچ فرش کرا دیا ہے ۔ اسی طرح ڈیوڑھی کے اندر بھی مستحکم مرمت کرا دی ہے ۔ اور اب یہاں حفاظت و نگرانی کے لئے سرکار کیطرف سے ایک مجاور بھی رہتا ہے +

مقبرہ کے چونہ گچ چبوترہ کے دو پہلوؤں پر پیپل کے دو بڑے بڑے درخت سہ حاکمانِ لاہور کی سنگدلی اور اس عمارت کی سخت جانی کی شہادت دے رہے ہیں +

مقبرہ کے بالکل محاذ میں مغرب کی سمت ایک پختہ مسجد ہے طوائف الملوکی کے ایام میں اس کا پتھر اُکھاڑا گیا ۔ اور عہدِ برطانیہ میں سنہ ۱۸۸۰ء سے پیشتر محکمہ ریلوے کے ملازم کسی انگریز نے اس کی شکل بدل کر اسے کوٹھی بنا لیا تھا ۔ اب وہاں نہ کوٹھی ہے نہ صاحب ۔ مسجد کے آثار البتہ نظر آ رہے ہیں

عہدِ مُغلیہ کے چند گورنر

(۱)

شاہ ابوالمعالی کو ہمایوں سے تربیت و عنایاتِ شاہی سے درجہ امارت پر پہنچنے کے بعد صوبہ پنجاب کی حکومت بھی عطا کر دی تھی ۔ اُس کی نخوت

وبے اعتدالی بلکہ بدخلقی و بدچلنی سے امرائے دربارِ لاہور کے علاوہ رعایا کے دل بھی شکایات و نفرت سے لبریز رہتے تھے۔ ہمایوں تک شکائتیں پہنچتی تھیں۔ لیکن وہ مناسب توجہ نہیں کرتا تھا۔ جب اکبر تخت نشین ہوا۔ تو شاہ ابوالمعالی اسے لڑکا سمجھ کر اور بھی کھُل کھیلے۔ اس کا اقتدار اور رُعب ایسا تھا۔ کہ کسی کو شکایت کی جُرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ کچھ لوگ سر پر کفن باندھ کر اکبر کے دربار میں پہنچے۔ بیرم خاں جیسا جہاندیدہ اس کا مشیر و اتالیق تھا۔ اُس نے جوابدہی کے لئے دربار میں بُلوایا۔ اور ذلیل و رُسوا کر کے اُسی لاہور میں جہاں وہ بادشاہی تقرب و حکومت کے غرور میں بے گناہوں کو لوٹتا۔ بے عزت کرتا۔ جیل خانوں میں بھجواتا اور بالاخر قتل کرا دینا بھی معمولی بات سمجھتا تھا۔ زندان خانہ میں ڈالدیا گیا +

(۲)

حسین خاں ٹکڑیہ دینداری سخاوت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ ۹۶۵ھ میں کہ اکبر کا اوائل عہدِ سلطنت تھا حاکم لاہور مقرر ہوا۔ فاضل بدایونی جس کے نوکِ قلم سے امرائے اکبری کے کلیجے چھلنی ہوتے رہے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتا ہے یہ جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ اور پلنگ اور نرم بچھونوں پر نہیں سوتے تھے۔ اس خیال سے کہ نہ آنحضرت نے ان تکلفات سے کام لیا ہے اور نہ اُس شخص کے لئے یہ مناسب ہے جس کے ذمہ غریبوں کی خبر گیری و حفاظت کا کام ہو۔ وہ چارپائی پر نہیں سوتا تھا۔ تہجد تک کی نماز قضا نہ کرتا تھا۔ لوگوں سے اپنی تعریف میں ایڈریس نہ لیتا تھا۔ بلکہ علماء و مشائخ کی صحبت سے اپنے عیوب و نقائص کی اصلاح کرتا تھا۔ پنجاب کی صوبداری کے علاوہ لاکھوں کی جاگیر کا مالک تھا۔ مگر خاصہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ نہ رکھتا تھا۔

کہتا تھا۔ جو روپیہ میرے پاس آتا ہے۔ جب تک خرچ نہیں کر لیتا پہلو میں تیر سا کھٹکتا رہتا ہے۔ غرباء۔ سفید پوش۔ مستحقین خیرات۔ بیوگان سب کے وظائف اور روزینے مقرر تھے۔ کوئی اس کے دربار سے خالی نہ جاتا تھا۔

سنہ ۹۸۵ھ میں انتقال کیا۔ تو ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ قرض نکلا۔ قرض خواہ آئے۔ سب نے خوشی خوشی تمسک پھاڑے اور مغفرت کی دعائیں دے کر چلے گئے۔

(۳)

حاجی محمد خاں سیستانی حاکم لاہور تھے۔ اور سکندر خاں سوری اپنی قومی جمعیت کے ساتھ پہاڑوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ کہ ہیموں پر اکبر کی فوجکشی کی خبر سن کر باہر نکلا۔ اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس زمانہ میں مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری کی دولت و مالداری کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا۔ اور اس وقت ہیموں کے استقبال اور سکندر کے اخراج کے لئے روپیہ اور فوج دو نوں کی ضرورت تھی۔ حاجی محمد خاں نے مخدوم الملک سے روپیہ نچوڑنے کا یہ بہترین موقعہ پایا۔ جب سیدھے ہاتھوں نہ ملا۔ تو اکبر کے خلاف سکندر کیسا سازش کرنے کا الزام لگا کر وہ گنج قارون جو اس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا۔ دم میں اُگلوالیا۔ بیرم خاں اتالیق کو اس سختی و تشدد اور اس ظلم و ناانصافی کی خبر ہوئی گورنر پر علانیہ خفگی و ناراضگی کا اظہار کیا۔ اور فتح کے بعد جب اکبر کے ساتھ لاہور آیا۔ تو حاجی کے وکیل کو مخدوم الملک کے گھر عذر تقصیر کے لئے بھجوادیا۔ اور اُس کے نام ایک لاکھ بیگہ کی جاگیر مقرر کرادی۔

(۴)

عہدِ اکبری کے گورنران لاہور میں مرزا حسین قلیچ جو اکبر کے سمدھی مرزا

قلیچ خاں اندجانی کا بیٹا تھا۔ ایک نامی گو نہ گذرا ہے۔ شجاع و سخی اور صاحب علم و فضل تہا۔ لیکن بہت بڑا عیب یہ تھا۔ کہ اپنے محبوب ترین بیٹے میرزا لاہوری (جو لاہوری بیگم کے بطن سے تھا) کی محبت میں ایسا مغلوب تھا۔ کہ اس کی ناہنجاریوں اور بدکرداریوں پر عمداً پردہ پوشی کرتا تھا۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے "میرزا لاہوری آئینے بود از جلال بل آفتے بود نالامالی پارچہ گوشتے کریہہ منظر بدخصائل" اُس کا عیش و نشاط یہ تھا۔ کہ لوگوں کو تازیانے لگاتا تھا۔ اور اُن کی چٹاخ پٹاخ سے خوش ہوتا تھا۔ خلق خدا اُس کے ظلم سے نالاں تھی۔ گورنر یعنی اس کے باپ کے پاس فریاد کرتی تھی۔ لیکن وہاں شنوائی نہ ہوتی تھی۔ جب خدمتگار پرا دنے سے قصور پر بھی ناراض ہوتا اُسے زندہ زمین میں گڑوا دیتا۔ اور کہتا جاؤ منکر نکیر کی خبر لاؤ۔ اور جو سوال و جواب ہوں وہ ہمیں بتاؤ۔ چند دنوں کے بعد گڑھے کھدوائے جاتے۔ تو وہ مظلوم مردہ پائے جاتے۔ مسلمان اور ہندو سب اس سے پناہ مانگتے تھے جب کسی شادی کا ذکر سنتا۔ تو خود وہاں جاتا۔ اور عروس کو جبراً اپنے مکان پر لے آتا۔ غرض اہل لاہور کی جان اس کریہہ منظر ناہنجار نوجوان کے ہاتھوں ایک عذاب میں مبتلا تھی۔ میرزا حسین قلیچ جو بادشاہ کی طرف سے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی عزت و آبرو کا محافظ تھا۔ باوجود دعویٰ و تقویٰ یہ سب کچھ دیکھتا تھا۔ اور بیٹے کو ایک لفظ تک نہیں کہتا تھا۔ آخر غریبوں اور مظلوموں کی ضعیف و کمزور آواز چند دل جلے ہندو مسلمانوں کی وساطت سے بارگاہِ اکبری تک پہنچی۔ اور تحقیقات کے بعد میرزا حسین قلیچ معزول کیا گیا۔ اور اس کے بیٹے کو ذلت کی تشہیر کے ساتھ زندان میں پہنچایا گیا ؏

(۵)

قوام الدین خاں اصفہانی عالمگیر کے سال جلوس ہفتم میں ہندوستان آیا۔ اور اکیسویں سال جلوس تک اس نے یہاں تک ترقی کی کہ صوبہ لاہور ہوگیا۔ بلکہ جموں کی فوجداری بھی اُسی کے سپرد ہوگئی۔ اندنوں لاہور میں سید علی اکبر الہ آبادی قاضی القضاۃ تھے۔ دونوں میں کسی بات پر مخالفت ہوگئی۔ کوتوال شہر نظام الدین نام بھی قاضی القضاۃ سے اس بناء پر جلا بیٹھا تھا۔ کہ قاضی اپنی عدالت میں پولیس کی ہر بات کو وحی والہام کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ گورنر کے حکم سے کوتوال قاضی کو گرفتار کرنے کے لئے گیا۔ قاضی اور اُس کے ہمشیرہ زادہ نے دروازے بند کر لئے۔ لیکن اس دار وگیر میں قاضی اور اس کا بھانجا دنیا کی دار وگیر سے مخلصی پا گئے۔

اہالیان لاہور نے اپنی گفتار و کردار سے کوتوال اور صوبہ لاہور پر لعن طعن اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ لاہور میں بلوۂ عظیم ہوگیا۔ عالمگیر کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ کوتوال اور صوبیدار دونوں کو خدمت و منصب سے معزول کر کے حکم دیا۔ کہ کوتوال کو تو ورثائے قاضی کے حوالے کیا جائے۔ اور صوبیدار کو دہلی بھیجا جائے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ لوگوں کو گورنر سے اس قدر نفرت تھی۔ کہ اُس کو ایک پردہ دار پالکی میں چھپا کر شہر سے باہر لے گئے۔

(۶)

عالمگیر نے انیسویں سال جلوس میں میر معین الدین احمد المخاطب بہ امانت خاں کو لاہور کی نظامت و دیوانی مرحمت کی۔ امانت خاں کے نام ایک مرتبہ بادشاہ کا حکم پہنچا۔ کہ فلاں شخص کو حاضر حضور کرو۔ امانت خاں نے اسکو طلب کیا

اور بادشاہ کا حکم سُنایا۔ وہ شخص بہت ڈرا۔ اُس نے کہا۔ اگر آپ میری جان و مال کے کفیل ہوتے ہیں۔ تو مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ امانت خاں نے کہا۔ میں ایسے شخص پر جس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو تم سے پوشیدہ نہیں ہے کس طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ مخبروں نے ڈاک پہ خبر بادشاہ کو پہنچائی۔ بادشاہ نے غم و غصہ سے بیتاب ہو کر منصب جاگیر اور دیوانی کی معزولی کا حکم دیا۔ مگر بعد میں خود ہی خیال آیا۔ کہ جو شخص امر حق کے اظہار میں ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ اور صرف اپنے خدا سے ڈرتا ہے۔ اس سے بہتر آدمی اور کہاں ملیگا۔ چنانچہ اس کی بحالی کے احکام دوبارہ جاری کیئے۔ بلکہ منصب و اعزاز میں اضافہ کر دیا (ماثرالامرا جلد دوم صفحہ ۲۶۱) امانت خاں سے اہل عملہ و دفتر سب نالاں تھے۔ لیکن عام لوگ اور زمیندار سب خوش تھے۔ ایک مرتبہ عمال لاہور نے بقایا و مطالبہ کے وصول نہ ہونے پر جیل خانہ میں اس قدر آدمی بھیجے کہ جگہ تنگ نہ رہی۔ امانت خاں کو جب علم ہوا۔ تو محبوس خانہ میں خود آیا۔ قیدیوں کو دیکھا اور بہت افسوس کیا۔ بعض سوالات کے جواب میں قیدیوں نے اپنی ناداری و فلاکت بیان کی۔ اور عمال مطالبہ دار کے مظالم بھی بیان کئے۔ امانت خاں نے سوچا۔ کہ ان کی جائدادیں ضبط کرنے اور ان کو جیل خانوں میں ٹھونس دینے سے حکومت کو بقایا و مطالبہ تو وصول ہونے سے رہا۔ البتہ ان لوگوں کے دلوں میں جو گرہ حکومت کے متعلق بیٹھ جائیگی اُس کا نکلنا دشوار ہو جائیگا۔ چنانچہ جن کے عذر معقول تھے۔ ان کو بالاقساط ادا کرنے کے وعدہ پر رہا کر دیا۔ اور ایک تعداد کو جو بالکل مفلس و نادار تھی بقایا رقم معاف کر دی۔ یہ رقم ماثرالامرا میں دو لاکھ روپیہ بیان

کی گئی ہے۔ عالمگیر نے سُنا۔ تو اُن کی مصلحت اندیشی اور خدا ترسی پر
تحسین کی ۔

(۷)

جب نادر شاہ ایرانی نے ہندوستان پر (سنہ ۱۷۳۹ء میں) حملہ کیا ہے
اسوقت محمد شاہ بادشاہ دہلی کیطرف سے پنجاب پر منیر الدولہ نواب زکریا خان
کی حکومت تھی۔ نواب زکریا خاں عادل گورنر اور ہر دلعزیز تھا۔ ان کی ہر دلعزیزی
وان کے عدل و انصاف کے تاریخوں میں کئی واقعات درج ہیں۔ یہاں
مختصر طور پر صرف ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:-

ایک آغا صاحب لاہور کی ایک باعصمت ہندو عورت پر فریفتہ
ہو کر اس کو بہکانے اور پھسلانے میں جب ناکامیاب رہے۔ تو اُسکی
دھوبن سے ملکر اور بہت تحفہ دے دلا کر اور اُسی ہندو عورت کے کپڑے
دھوبن کو پہنا کر گھر میں بُلا لیا۔ نکاح خوان اور دوست احباب سب پہلے
ہی موجود تھے۔ ظاہر یہ کیا۔ کہ وہ ہندو عورت مسلمان ہونے آئی ہے۔ اور اسلام
قبول کرنے کے بعد آغا صاحب سے باقاعدہ اس کا نکاح ہو جائیگا چنانچہ
ساری کارروائی مقررہ پروگرام کے مطابق طے پائی۔ خرمے لٹائے گئے۔
اور دوسرے دن دعوتِ ولیمہ بھی تیار ہو گئی۔ یہ کھیل رچانے کے بعد آغا
صاحب ہندو عورت کے خاوند کے گھر پہنچے۔ اور کہنے لگے۔ کہ تمہاری عورت
مسلمان ہو کر میرے ساتھ نکاح پڑھا چکی ہے۔ اور اب مرتد ہو کر پھر یہاں آگئی
ہے۔ بھلامانس ہے تو اس کو باہر نکال دے۔ ورنہ زبردستی لیجاؤنگا۔ خاوند
اور بیوی اور ان کے رشتہ دار آغا صاحب کے یہ الفاظ سُن کر دریائے ندامت
میں غرق ہو رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ زمین پھٹے اور ہم سما جائیں۔

مختصر یہ ہے ۔ کہ مقدمہ لاہور کے قاضی صاحب کے سامنے پیش ہوا۔
اور اس ملمع سازی سے پیش کیا گیا ۔ کہ قاضی صاحب کو فیصلہ آغا صاحب
کے حق میں دینا پڑا ۔ جب یہ فتوے تعمیل کے لئے زکریا خاں کے پاس
آیا ۔ تو ساری مثل پڑھنے کے بعد حکم دیا ۔ میں سوچ سمجھ کر حکم دونگا ۔
اُس نے رات کو بھیس بدلا ۔ پہلے کھتریوں کے محلہ میں گیا ۔ وہاں کچھ
آدمی آغا کی زیادتی اور ہندو عورت کی پاکدامنی کی باتیں کر رہے تھے ۔ پھر
آغا کے محلہ میں گیا ۔ وہاں جاتے ہی سُنا ۔ یہ مغل مفتری جھوٹا اور مکار ہے
اُس نیکبخت ہندو عورت کو ہم نے کبھی اس سے بات چیت کرتے دیکھا ہے
نہ کبھی اُس کے مسلمان ہونے کی خبر سُنی ہے ۔ اُس نے جعلسازی کر کے خود ہی
اس کے مسلمان ہونے اور اسے اپنے نکاح میں لانے کی خبر مشہور کر دی ہے
غرض پتہ چلتے چلاتے دھوبن نے بھی ساری داستان کہہ سُنائی ۔ جب
زکریا خاں کا کامل اطمینان ہو گیا ۔ اور چاروں طرف سے اس ہندو عورت کی
عصمت و عفت کی شہادتیں مل گئیں ۔ تو آغا صاحب اور اُس کی دھوبن کو
قتل کی سزا کا حکم سُنا کر نہ صرف اس عورت کے ناموس کو ہمیشہ کے لئے بدنامی
سے بچا لیا بلکہ اپنے لئے بھی بقائے دوام کا خلعت حاصل کر لیا ۔

انارکلی[1]

لاہور کا انارکلی بازار نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں

[1] انارکلی کے متعلق عہد اکبری اور عہد جہانگیری کی تاریخیں قطعی خاموش ہیں ۔ اور تعجب آتا ہے ۔ کہ عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل اور عہد اکبر کے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۹۲)

میں اپنی رونق۔ چہل پہل اور اپنے دلکش اور عجیب و حیرت افزا و شگفتہ نام کی وجہ سے مشہور ہے۔ مگر یہ بات کس قدر عجیب بات ہے۔ کہ جس قدر اسکی شہرت عالمگیر ہے۔ اسیقدر اسکی اصل وجہ سے نہ صرف پنجاب و ہندوستان کے لوگ بلکہ خود اہل لاہور بہت کم آگاہ ہیں۔ اور اس بات کا تو شاید کسی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱) دیگر مورخوں نے اس عظیم واقعہ کو کس طرح فراموش کر دیا۔ اسی بناء پر بعض مبصرین اس واقعہ کی صحت بلکہ انار کلی کے وجود کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں البتہ لاہور کی تاریخوں میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اور انہی تاریخوں سے ہمارا مضمون ماخوذ ہے:۔

جہانگیر کے زمانہ میں کئی فرانسیسی اور انگریز سیاح ہندوستان میں آئے ہیں ان میں سر ٹامس رو سفیر شاہ انگلستان۔ فرانسیسی ڈاکٹر برنارڈ۔ ڈاکٹر برنیر۔ کپتان ہاکنس اور ہربرٹ صاحب بہت مشہور ہیں۔ ان سب نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ اور ہر چند ان میں بہت کچھ اناپ شناپ بھی ہے۔ مگر بہت سے ایسے حالات بھی ہیں۔ جن سے اُس زمانہ کے درباری واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں ہربرٹ صاحب جس نے عہد جہانگیر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ ۱۶۲۶ء میں ہندوستان میں آیا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں (جس کا حوالہ کارنامہ جہانگیری صفحہ ۲۵۷ پر ہے) ایک واقعہ ایسا لکھتا ہے۔ جس کا تعلق انار کلی سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "جہانگیر نے اکبر کی کسی بیوی کو جو اُسے نہایت عزیز تھی۔ اور انار کے نام سے مشہور تھی بے عزت کیا۔ باپ کے اس وعدہ پر کہ میں تجھے معاف کردونگا۔ بیٹے نے اطاعت کرلی۔ باپ بیٹے کو حرم سرا میں لے گیا اور طیش میں آکر اور وعدہ کو بھول کر بیٹے کو گدھا اور احمق کہا۔ اور ایسے گھونسے مارے کہ وہ گر پڑا۔" مسلمان ان سفرناموں کو غیر معتبر جانتے ہیں اور اپنی قصہ کہانیوں اور بازاری افواہوں کے اندراج کی نمائشی دلچسپیوں کیوجہ

(بقیہ حاشیہ برصفحہ ۹۳)

شان گمان بھی نہ ہو۔ کہ یہ ایک ایسی عورت تھی۔ جس کے حسن والا ویز نے اکبری
محلوں میں شاہزادیوں اور شاہی بیگمات کو پریشان کر رکھا تھا۔
اس کا اصل نام نادرہ بیگم بتایا جاتا ہے۔ اکبر کی شاہی کنیزوں میں نہایت
حسینہ و جمیلہ تھی۔ کمال حسن کی وجہ سے اکبر کی اسقدر منظور نظر تھی۔ کہ حرم سرا
میں تمام بیگمات اس کے عروج و اقبال اور رسوخ و اقتدار سے خوف کھاتی تھیں
بادشاہ نے اپنی اس کنیز کا نام انارکلی رکھا۔ جس کا چہرہ گل انار کیطرح سُرخ

سے وہ ہیں بھی اسی قابل۔ مثلاً اکبر کی تمام شادیوں کا جو مسلمانوں کے ہاں اور
راجپوت راجاؤں کے ہاں ہوئی ہیں سب تاریخوں میں ذکر ہے۔ لیکن انار کے
نام سے اُس کی کسی بیگم یا رانی کا ذکر نہیں ہے۔
ہربرٹ کے یہ الفاظ بھی پایۂ صداقت سے گرے ہوئے ہیں۔ کہ اُس
نے جہانگیر کو جو اپنی پیدائش ۹۷۷ھ کے مطابق اس وقت ۳۱ سال
کی عمر کا تھا۔ اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ اسے گھونسے مارے کہ وہ گر پڑا۔
البتہ انارکلی کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ دارا
شکوہ نے جو جہانگیر کا پوتا اور شاہجہان کا ولیعہد تھا۔ اپنی کتاب
سکینۃ الاولیا میں باغ انارکلی کا ذکر کیا ہے۔ خیال یہ ہے۔ کہ انارکلی کا
اصل نام ضرور کچھ اور ہی ہوگا۔ اس کا نام نار یا انارکلی اکبر نے
اس کی خوبصورتی کی وجہ سے رکھ دیا ہوگا۔ "انارکلی" گو بے ربط سا
نام ہے۔ لیکن ایسا ہی ہے۔ جیسا جہانگیر کے زمانہ میں شراب کا نام
"رام رنگی" تھا۔

تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہزادہ سلیم اور انارکلی کی آپس میں خفیہ محبت تھی۔ چونکہ عشق اور مشک چھپے نہیں رہ سکتے۔ اس لئے رازِ محبت خواہ لاکھ پردوں میں ہو۔ پھر بھی افشاء ہو ہی جاتا ہے۔ بقول استاد داغ ؎

ہم بھی رسوا ہو گئے وہ بُت بھی رسوا ہو گیا
رازِ دل جتنا چھپایا اتنا افشا ہو گیا۔

رفتہ رفتہ یہ ناشدنی خبریں بادشاہ کے گوش گزار بھی ہوئیں۔ بلکہ ایک مرتبہ اکبر شیش محل میں نشست فرما تھا۔ انارکلی بھی موجود تھی شاہزادہ سلیم بھی وہاں آ گیا۔ دونوں کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور پیار و محبت کی جو باتیں ایک دوسرے سے کرنا چاہتے تھے وہ دل سے زبان پر تو نہ لا سکتے تھے۔ مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں سب مطلب ادا ہو رہے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی دیتے تھے۔ اکبر کی نگاہ بڑی دُور رس تھی۔ وہ یہ تمام حرکات اسی آئینہ خانہ میں ایک دوسرے کے عکسوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور جو باتیں وہ کئی دنوں سے ان دونوں کے متعلق سُن رہا تھا۔ آج اپنی آنکھوں سے اسکی تصدیق کر رہا تھا۔

شاہی کنیز۔ شہنشاہ اکبر کی چاہتی کنیز۔ اور شاہزادہ کے ساتھ دل لگی یہ جرم ناقابل عفو تھا۔ اور اس کے لئے اب کسی دلیل، وکیل اور اپیل کی ضرورت نہ تھی

یہ صحیح ہے۔ کہ اکبر بڑا رحمدل تھا۔ جب جہانگیر نے شہزادگی کے عالم میں ایک مجرم کی کھال اتروائی۔ تو بادشاہ نے کہا۔ ہم سے تو بکرے کی کھال تک بھی نہیں اُتر سکتی۔ تم نے اتنا بڑا ظلم کس طرح روا رکھا۔ مگر یہ

بھی درست ہے۔ کہ جب اس کی تیوری پر بل پڑ جاتا تھا۔ تو شاہی سیاست کے آگے کسی کی سفارش نہ چلتی تھی۔ "دربار اکبری" دیکھو اور عہد اکبری کی دوسری تاریخیں ملاحظہ کرو۔ تم کو معلوم ہوگا۔ کہ اکبر ماہم کا ادب اس لحاظ سے کہ وہ شاہی انّا تھی۔ اپنی ماں سے کم نہ کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے بیٹے ادہم خاں نے شمس الدین انکہ خاں اعظم کو بیگناہ مار ڈالا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ادہم خاں کو دولت خانہ کے کوٹھے سے جو چھتیس ۳۶ فٹ بلند تھا۔ سرنگوں گرادو۔ جب اس کی لاش ماہم کے پاس گئی۔ تو اکبر خود معذرت کے لئے اس کے پاس گیا اور کہا۔ کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

اسی طرح اکبر کی نظروں میں سلیم اور انارکلی کی محبت ناقابل معافی گناہ تھی۔ دونوں مجرمان عشق یکساں سزا کے سزاوار تھے۔ مگر سلیم شہزادہ تھا۔ ولیعہد تھا۔ لخت جگر تھا۔ بچ گیا۔ اور انارکلی کو جرم الفت کی وہ سزا ملی۔ جس کی اکبر جیسے شہنشاہ سے بہت کم توقع ہو سکتی تھی۔ وہ سزا کیا تھی۔ وہ نہایت خوفناک سزا تھی۔ "زندہ درگور" کے الفاظ سب لوگوں نے سُنے ہیں۔ مرزا داغ بھی کہتے ہیں ؎

زندہ درگور زمانے میں نہ ہونگے ایسے
مرثیہ پڑھتے ہیں شاعر ترے بیماروں کا

لیکن کیا کبھی کسی کو زندہ درگور ہوتے دیکھا بھی ہے؟ انارکلی جس کے حُسن ودلکش نے بیگمات شاہی کا چراغ ماند کر رکھا تھا۔ جس کی ایک ایک ادا پر سلیم سو سو جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ کیا اس قابل تھی۔ کہ زندہ درگور کر دی جاتی۔ مگر نوشتۂ تقدیر کون مٹا سکتا ہے۔ اکبر نے انارکلی کے زندہ زمین میں چنوائے جانے کا حکم دیا۔ شاہی حکم

کے بموجب انار کلی کو لاہور کے اُس مقام پر جہاں مقبرہ انار کلی کی عالیشان عمارت اب تک اشکِ حسرت بہا رہی ہے۔ کھڑا کیا گیا۔ اور اس کے گرد اینٹوں کی دیوار چن دی گئی۔ جہاں اُس حُسن کی دیوی نے دم گھٹ گھٹ کر جان دیدی۔ یہ واقعہ ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۵۹۹ء کا ہے۔

سلیم کو خبر ہوئی۔ وہ بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر جب باپ کے انتقال (۱۳۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کے بعد پہلی مرتبہ لاہور میں آیا۔ تو اپنی محبوبہ کے جائے مدفن پر ایک عظیم الشان مقبرہ اور خوش وضع باغ تعمیر کئے جانے کا حکم دیا۔ جو ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء میں طیار ہو گیا۔

سلیم کو انار کلی سے کس درجہ محبت تھی۔ وہ اس کے ذیل کے شعر سے جو انار کلی کی قبر کے تعویذ پر جس کے سینے پر باری تعالےٰ کے ننانوے نام لکھے ہوئے ہیں۔ درج ہے

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را   آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را

یہ شعر نہیں ہے۔ ایک تمنا۔ وہ افسردہ بلکہ مردہ دل کی آہ کا دھواں ہے اُس آنکھ کا قطرۂ اشک ہے۔ جو نگہہ انتظار اور چشم شوق کے نام سے موسوم ہے۔ اور آج تھک کے گر پڑی ہے۔ یہ شعر۔ یہ کتبہ۔ یہ الفاظ شہزادہ سلیم کے عشقِ حقیقی کا مظہر ہیں۔

قبر کے تعویذ پر جو خالص سنگِ مرمر کا ہے۔ ایسی خوبصورت اور نفیس مینا کاری کا کام ہے۔ کہ مسٹر ڈسلوٹک ایک یوروپین سیاح اس کے متعلق لکھتا ہے "وہ دنیا میں سب سے نفیس سنگ تراشی کے کاموں میں سے ہے"

اس خوبصورت عمارت کی چھت پر جس کے نیچے حُسن و عشق کی زندہ تصویر

دفن ہے۔ ایک بہت بلند گنبد ہے۔ جو قدیم مغلیہ عہد کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے نیچے آٹھ بڑی محرابیں ہیں۔ اس گنبد کا طول مشرق سے مغرب تک ۷۵ فیٹ ۱۰ انچ ہے۔ گنبد دو منزلہ ہے۔ روشندان جالی دار، بُرجیاں کھڑکیاں، دروازے۔ محراب بکثرت تھے۔ حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس عمارت میں بھی حسب ضرورت ردّوبدل ہوتا رہا +

مقبرہ کے باغ میں بہت سی خوبصورت عمارتیں بھی جہانگیر کے حکم سے تیار ہوئی تھیں۔ اس زمانہ میں دریائے راوی مقبرہ اور باغ کی دیواروں کے ساتھ بہتا تھا۔ دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں اس باغ اور مقبرہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ حضرت میاں میرؒ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ شہر کے جنوب کی طرف انارکلی باغ کے اس گنبد میں جو باغ مذکور کی جنوبی دیوار کے کونے میں واقع ہے۔ حضرت کبھی کبھی دن کے وقت جا کر آرام فرمایا کرتے تھے +

عالمگیر کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں بھی باغ اور مقبرہ کی عمارات اور اس کے قیمتی پتھروں پر کوئی آفت نہ آئی تھی۔ مگر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۱ء میں اس مقام کو چھاؤنی بنا کر یہاں سکھوں کی چار پلٹنیں جنرل ونتورا کے ماتحت مقرر کیں۔ تو باغ بالکل ویران ہو گیا۔ بلکہ زمین صاف کر کے پریڈ گراؤنڈ بنا دی گئی۔ انارکلی کی قبر کا تعویذ صرف اس وجہ سے بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ کہ اس پر باری تعالےٰ کے ننانوے نام لکھے ہوئے تھے۔ اور وہ سکھوں کے کسی مصرف کے نہ تھے +

البتہ چبوترہ جو قبر کے تعویذ کی طرح خالص سنگ مرمر کا تھا۔ صحیح و سالم اُتروا کر امرتسر میں دربار صاحب کی زینت افزائی کے لئے بھیج دیا گیا +

۱۸۱۶ء مطابق ۱۸۷۳ب میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ولیعہد شہزادہ کھڑک سنگھ کو جس کی عمر اسوقت پندرہ سال کی تھی ولیعہدی کا خلعت دینے کیلئے ایک بہت بڑے جشن کی تیاری کی۔ تو اس کیلئے مقبرہ انار کلی کا مقام ہی تجویز کیا گیا۔ جہاں پنجاب کے نامی سرداروں لاجوں اور جاگیرداروں کے خیمے نصب ہو گئے۔ ہزارہا لوگ اس جشن کی رونق دیکھنے کیلئے قرب جوار سے آئے۔ نجومیوں اور پنڈتوں نے اس تقریب کا مہورت ۱۵ ماگھ تجویز کیا۔ مہاراجہ نے کھڑک سنگھ کو اپنے روبرو اپنے ہاتھ سے مسندِ شاہی پر بٹھایا۔ تمام روساء راجگان اور اہل دربار سے نذریں دلوائیں۔ اور کئی دن تک اس مقام پر ہنگامہ عیش و عشرت گرم رکھا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے جب پنجاب کا الحاق کیا۔ تو مقبرہ انار کلی کا نام سکھ افواج کے مقیم رہنے کیوجہ سے چھاونی انار کلی مشہور تھا۔ انگریزی حکام نے اس کی مرمت کرائی۔ اور اس مقبرہ کو پروٹسٹنٹ گرجا کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اور نام اس کا سینٹ جیمس چرچ انار کلی رکھا۔ انار کلی کی لاش زمین کھود کر باہر نکالی گئی۔ اور اُسے ایک ستون کے نیچے دبا دیا گیا۔ قبر کا تعویذ جس پر اسمائے الٰہی کے علاوہ انار کلی کا سن وفات اور مقبرہ کا سن تعمیر بھی درج ہے۔ اب تک ایک کمرے میں بند پڑا ہے۔ ۱۸۹۴ء یا اس کے کچھ عرصہ بعد تک یہ مقبرہ گرجا گھر کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ بعد ازاں اسکی عمارت میں کچھ اور ترمیم و اصلاح کی گئی۔ اور یہاں فنانشل دفتر قائم کیا گیا۔ وہ دفتر اب تک وہاں موجود ہے +

لاہور میں سب سے پہلے جو بڑا کلاک آیا۔ وہ اسی گرجا گھر یعنی مقبرہ انار کلی میں آویزاں کیا گیا۔ لاہور کے لوگ جب اسکی آواز سنتے تھے۔ اور یہ دیکھتے تھے۔ کہ وہ آواز خود بخود نکل رہی ہے تو بڑے حیران ہوتے تھے۔ یہ حالات غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر کے ہیں +

گوسفند قربانی یا شہزادہ داور بخش

شہزادہ داور بخش جہانگیر کا پوتا اور خسرو کا بیٹا تھا۔ جب جہانگیر نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ

کو کشمیر سے واپس آتے ہوئے بمقام چنگز (متصل راجوری) انتقال کیا۔ تو آصف جاہ اور نور جہاں یعنی بہن بھائیوں کی علانیہ عداوت نے لشکر میں تردد عظیم پیدا کر دیا۔ نور جہاں کا داماد شہریار لاہور میں تھا۔ جو عیاشیوں کی وجہ سے مختلف عوارض میں مبتلا رہتا تھا۔ اور جس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی جھڑ گئے تھے۔ اس نے لاہور میں اپنے آپ کو بادشاہ مشہور کیا۔ اور سات لاکھ روپیہ سات دن میں خرچ کر کے ایک فوج مہیا کر لی۔ آصف جاہ کا داماد شاہجہان تھا۔ جو باپ کی وفات کے وقت دکن میں تھا۔ آصف جاہ نے بنارسی نام ایک تیز رو ہندو کو اپنی مہر کی انگشتری اور زبانی پیغام دیکر دکن روانہ کیا۔ اور ادھر شاہزادہ خسرو کے بیٹے داور بخش کو زندان خانہ سے نکالکر سلطنت کی مبارکباد دی۔ اور کہا۔ کہ مسلح ہو۔ پر لگا کر لاہور پہونچو۔ اور شہریار کا کانٹا نکالو۔ داور بخش سمجھتا تھا کہ نور جہاں اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہے۔ اور آصف جاہ شاہجہان کے لئے بے چین ہے۔ اسلئے اس نے یاور نہ کیا۔ کہ آصف جاہ مجھے واقعی بادشاہ بنانا چاہتا ہے۔ شاہزادہ نے کہا میری جان سلامت رہنے دو۔ میں بادشاہی نہیں چاہتا۔ آصف جاہ نے قسمیں کھائیں اور یقین دلایا اور کہا۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ تخت بالکل خالی ہے۔ داور بخش اجل گرفتہ امید و بیم کے ساتھ راضی ہو گیا۔ تمام امراء آصف جاہ سے دبتے تھے۔ وہ مدار المہام کل تھا۔ سب جانتے تھے۔ کہ یہ غریب (داور بخش) شاہجہان کیلئے گوسفند قربانی ہے لیکن کسی نے دم نہ مارا۔ آصف جاہ نے مزید احتیاط کیلئے تمام لوگوں کی آمد و رفت نور جہاں کیساتھ بند کرا دی۔

غرض جب لاہور تین کوس رہ گیا۔ شہریار نے سلطان دانیال (خلف اکبر) کے بیٹے میرزا بایسنغر کی سرداری میں دو تین ہزار فوج داور بخش کے مقابلہ پر بھیجی۔ اور آپ شہر میں نیرنگی تقدیر کا انتظار کرنے لگے۔ پہلے ہی حملہ میں میرزا کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ شہریار کو خبر ہوئی۔ سراسیمہ ہو کر قلعہ کے اُن مکانات میں جھپ گیا۔ جہاں جہانگیر کے حرم سرا قیام کیا کرتے تھے آصف جاہ اور دیگر امراء داور بخش کی ہمراہی میں قلعہ میں داخل ہوئے۔ اسکو تخت پر بٹھایا مبارک سلامت کا چاروں طرف غل ہوا۔ اور وزارت کی باگ آصف جاہ نے اپنے ہاتھ

میں رکھی خسرو کی تلاش ہوئی۔ آخر فیروز خاں نام ایک خواجہ سرا خسرو کو حرم سرا سے باہر لایا۔ اُس کے دونوں ہاتھ باندھے گئے۔ اُس کی کمر میں رسہ ڈالا گیا۔ اور داور بخش کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تسلیم و کورنش کے مراسم اس سے ادا کرائے گئے۔ الفاظ آصف جاہ کے ہوتے تھے زبان غریب داور بخش کو ہلانی پڑتی تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی دن شہریار کی آنکھوں میں داور بخش کے حکم سے سلائی پھیر کر اُسے اندھا کر دیا +

داور بخش بیچارا تخت پر بیٹھنے اور تاج شاہی سر پر رکھنے کا گنہگار تھا۔ اندر باہر سب جگہ آصف جاہ کی حکومت تھی۔ آصف جاہ کی اجازت کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ آصف جاہ کو رات دن شاہجہان کی آمد کا انتظار تھا۔ آخر اُس کا پیغام پہونچا۔ کہ ہمارے آنے سے پیشتر داور بخش اور تمام شہزادوں کو صحرائے عدم میں پہونچا دو تاکہ بعد میں کسی کی طرف سے کوئی کھٹکا نہ رہے +

چنانچہ ۲۔ ربیع الآخر سنہ ۱۰۳۷ھ ہفتہ کا دن تھا۔ کہ داور بخش کو تخت سے اُتار کر قید خانہ میں ڈالا گیا۔ اور شاہجہان کا خطبہ پڑھا گیا۔ وہ آصف جاہ کو اُس کے قول و قسم اور عہد و پیمان یاد دلاتا رہا۔ مگر کون سُنتا تھا۔ جب خبر پہونچی کہ شاہجہان آگرہ آگیا ہے۔ تو آصف جاہ نے بدنصیب شہزادوں کو جو لاہور میں قید تھے۔ زندان سے باہر نکالا۔ اور یکے بعد دیگرے ایک ہی دن سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ مآثر الامراء میں ان شہزادوں کے نام حسب ذیل درج ہیں:۔ شہزادہ داور بخش عارضی حکمران ہند اور اس کا بھائی گرشاسپ۔ سلطان شہریار داماد نورجہان خلف جہانگیر۔ شہزادگان طہمورث و ہوشنگ پسران سلطان دانیال خلف شہنشاہ اکبر۔ ان سب شہزادوں کو یہ قیامت خیز واقعہ ۲۶۔ جمادی الاول سنہ ۱۰۳۷ھ کا ہے۔ ان کے دفن کفن کے بعد آصف جاہ۔ شہزادہ دارا شکوہ۔ محمد شجاع اورنگ زیب کو لیکر جو اسکے نواسے تھے آگرہ کیطرف روانہ ہوا۔ جہاں بتاریخ ۲۔ رجب سنہ مذکور اس نے شاہجہان کو تخت سلطنت کی مبارکباد دی۔ اور یمین الدولہ آصف خاں کا خطاب حاصل کیا +

باغ میا بائی (چوبرجی)

زیب النساء بیگم نے اپنے دادا شاہجہان کیطرح لاہور میں ایک عالیشان باغ تیار کرایا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اپنی وسعت و لاگت اور عمارات کی خوبصورتی و نفاستی کی وجہ سے شالامار باغ سے دوسرے درجہ پر تھا۔

نواں کوٹ[1] کی چار دیواری پونچھ ہوس[2] کا وسیع احاطہ۔ کچھ حصہ خطہ میابائی کا باغ کی ڈیوڑھی المشہور چوبرجی کے عقب کا تمام نشیبی حصہ جہاں زراعت ہوتی ہے۔ اور شمالی جانب کی بعض کوٹھیاں اور غربی جانب کے بعض چاہات سب اسی باغ کے حدود میں شامل تھے

---

[1] نواں کوٹ مہر محکم الدین نے جس کی مدد سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تھا ۱۷۹۸ء میں یا اس کے قریب آباد کیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ موضع باغ کے عین وسط میں واقع ہے۔ نواں کوٹ میں منڈی ہر قسم کی لگتی تھی۔ اور یہ موضع خوب رونق پر تھا۔ جب مہاراجہ کی محبوبہ موراں کنجری اور مہر محکم الدین کی آپس میں مخالفت ہوگئی۔ تو مہاراجہ نے موراں کی خاطر اپنے محسن مہر محکم الدین کی جاگیر ضبط کر لی اور منڈی اس کے موضع سے اٹھالی۔ موضع اچھنگ آباد ہے ؞

[2] پونچھ ہوس۔ راجہ پونچھ (کشمیر) کی کوٹھی کا نام ہے۔ جس کا بڑا دروازہ چوبرجی کی ڈیوڑھی اور چنگی خانہ کی چوکی کے متصل ہے۔ اس وسیع احاطہ کے اندر جو عالیشان بنگلہ ہے۔ وہ لارڈ لارنس پنجاب کے سب سے پہلے انگریز حاکم (بعد میں وائسرائے ہند) کی اس زمانہ کی قیامگاہ ہے۔ جب مہاراجہ دلیپ سنگھ کے زمانہ میں سکھ فوج کی تنبیہہ کے لئے انگریزی فوج لاہور میں مقیم تھی۔ یہ بنگلہ پہلے سر راجہ بلدیو سنگھ والئی ریاست پونچھ ولد راجہ موتی سنگھ ولد راجہ دھیان سنگھ وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ میں تھا۔ اب اسکی وفات کے بعد راجہ سکھدیو سنگھ والئی ریاست کے قبضہ میں ہے۔

آج سے اسی[1] سال پیشتر مقام پیر[2] مکی صاحب اور متصل مکان داتا گنج بخش صاحب اس باغ کی دیوار اور اس کے متعلقہ مکانات کی بعض بنیادوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار ملتے تھے۔

ملتان روڈ اس باغ کے دروازے کے سامنے سے گذرتی ہے۔ اس کا دروازہ جو چوبرجی کے نام سے مشہور ہے۔ نقش و نگار کی وجہ سے آج سوا دو سو سال گذر جانے کے بعد بھی بالکل تازہ نظر آتا ہے۔ دروازہ کے سب سے اوپر کے محراب پر نیلگوں حروف میں آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے اختتام پر چینی کے لفظوں میں ۱۰۵۶ھ (مطابق ۱۶۴۶ء) جو باغ کی بنیاد کا سال ہے درج تھا۔ مگر اب یہ حروف بالکل مٹ گئے ہیں۔ آیۃ الکرسی کے دونوں طرف ذرا نیچے دو دو مرتبہ اللہ کا لفظ تحریر ہے۔ بڑے محراب کے نیچے ایک چھوٹا محراب ہے۔ جس میں چار مصرعے درج تھے۔ اب صرف تین حسب ذیل ہیں

بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضواں
. . . .
بگشت مرحمت ایں باغ بر میا بائی
زلطف صاحب زیبندہ بیگم دوراں

میا بائی زیب النساء بیگم کی چاہتی کنیز تھی۔ زیب النساء نے جب اس جگہ باغ احداث کرانا شروع کیا۔ تو اس کا تمام انتظام و انصرام اپنی عزیز کنیز میا بائی

---

[1] یہ نشانات مولوی نور احمد چشتی مصنف کتاب تحقیقات چشتی نے اپنی کتاب میں چشم دید لکھے ہیں۔ اب ان کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

[2] شہر لاہور سے مغرب اور مزار حضرت داتا گنج بخش سے شمال کی طرف یہ مزار واقع ہے۔ یہ بزرگ جن کا نام جلال الدین بیان کیا جاتا ہے۔ بعہد سلطان شہاب الدین غوری مکہ سے وارد ہند ہوئے تھے۔ اسوقت خاندان غزنوی کا آخری بادشاہ خسرو ملک پنجاب میں حکومت کرتا تھا۔ آپ کے[3] مفصل حالات سوانحعمری حضرت داتا گنج بخش مصنفہ راقم سے مل سکتے ہیں

کے سپرد کیا۔ جب باغ کی تکمیل ہو گئی۔ تو شاہزادی اس کے ملاحظہ کے لئے روانہ ہوئی راستہ میں اُس نے چند لوگوں سے یہ کہتے سُنا۔ کہ شاہزادی میا بائی کا باغ دیکھنے کو جا رہی ہے۔ شاہزادی نے جب یہ سُنا۔ کہ باغ نے ایک کنیزک کے نام سے شہرت پائی ہے۔ تو اُس نے رستے ہی میں ارادہ کر لیا۔ کہ میں یہ باغ میا بائی کو دیدونگی۔ جب وہ باغ میں پہونچی اور دروازہ میں داخل ہوئی۔ تو میا بائی جھک کر آداب بجالائی اور اُس کو درازئے عمر کی دعائیں دینے لگی۔ شاہزادی نے دروازہ سے آگے اُس وقت قدم اُٹھائے۔ جب یہ اعلان کر دیا۔ کہ میں نے یہ باغ تم کو اپنی خوشی سے تمہاری خدمات و قابلیت کی وجہ سے تمہیں بخش دیا[1]

اِس عظیم و وسیع باغ کا صرف دروازہ ہی قائم ہے۔ جس کی دو منزلیں ہیں۔ اُوپر اور نیچے کئی کوٹھڑیاں ہیں۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف سنگِ مرمر کی تختی پر بہ الفاظ درج ہیں "جو شخص اس یادگار کو نقصان پہونچائیگا۔ یا اس کی تختی کو بگاڑے گا۔ اس کو قید کی سزا دی جائیگی۔ جس کی میعاد تین ہفتہ ہو سکتی ہے۔ یا اُس پر جُرمانہ کیا جائیگا۔ یا قید اور جُرمانہ دونوں سزائیں دی جائینگی" یہ الفاظ گورمکھی۔ اُردو۔ انگریزی میں تحریر ہیں ٭

باغ کی چاردیواری نہایت مضبوط اور چُونہ گچ تھی۔ جب دریا کی شورش انگیز لہریں چاردیواری آ پہونچیں۔ تو نہ صرف چاردیواری بلکہ باغ کے اندر کی شاندار عمارتیں بھی مسمار ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اب صرف ڈیوڑھی کا دروازہ جس کا

---

[1] از تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ جج محمد لطیف بحوالہ شاہجہان نامہ ٭

نام چوبرجی ہے باقی رہ گیا ہے ٭

۱۸۴۳ء میں اس کے چاروں مینار موجود تھے۔ مولوی نور احمد چشتی جو اُس
زمانہ میں زندہ تھے لکھتے ہیں۔ ایک مینار ہمارے دیکھتے دیکھتے مسمار ہو گیا۔ نشان
اس مسمار شدہ برجی کے موجود ہیں۔ اب صرف تین مینار باقی ہیں۔ سرکار نے اس
کے گرد لوہے کا جالی دار تار لگا کر باغ کے ان آثار قدیمہ کو محفوظ کر دیا ہے۔
اس باغ کی دیوار جس کو اب چوبرجی کہتے ہیں ملتان روڈ پر قلعہ لاہور سے دو
میل کے فاصلہ پر ہے ٭



بیگم پورہ (لاہور)

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

لاہور عہد قدیم سے نامور شہر چلا آتا ہے۔ مگر جو عظمت و شہرت اور وسعت و دولت اس کو عہد مغلیہ اور خصوصاً عروج مغلیہ کے ایام میں نصیب ہوئی ہے۔ اس نے اس کی اہمیت بہت بڑھا دی۔ اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک یعنی ۱۵ سال کامل لاہور ہی میں رہا ہے۔ اس کا نامور پوتا شہنشاہ شاہجہان ۱۰۰۰ھ میں لاہور ہی میں بموجودگی اکبر پیدا ہوا۔ اکبر نے اور اس کی تقلید میں اس کے وزراء امراء نے لاہور میں عالی شان باغات اور فلک رفعت مکانات "بیرون شہر" تعمیر کرائے۔ لاہور کا مشہور ہیبت افزا قلعہ اکبری دروازہ اور اکبری منڈی ابھی تک اکبر کی یادگاریں لاہور میں موجود ہیں

لاہور میں ایک محلہ مغلپورہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ سے آباد چلا آتا تھا۔ یہ بستی بیرون شہر ان لوگوں نے آباد کی تھی۔ جو ترک وطن کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اسی زمانہ سے اب تک اس کا نام مغلپورہ مشہور چلا آتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں جو مغلوں کا عروج نخستین تھا۔ اس محلہ کے نصیب جاگے۔ اور یہاں نامور درباری لوگوں نے اپنے محلات اور باغ باغیچے

کرائے۔ اسی مغلپورہ میں بعہد شہنشاہ جہانگیر حضرت خواجہ خاوند محمود المشہور حضرت ایشاں نے کشمیر سے تشریف لاکر خانقاہ مسجد اور باغ کی عمارتیں تعمیر کیں۔ اور اسی محلہ میں ۱۰۵۲ھ میں بعہد شاہجہان وفات پائی۔

عالمگیر کی حکومت کا آخری مگر طویل حصہ مہمات دکن میں صرف ہونے بلکہ وہیں وفات پا جانے کی وجہ سے لاہور میں گو ناظمان لاہور موجود رہتے تھے۔ اور ان کے دیوان اور وزیر، درباری ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ مگر جو رونق بادشاہی امراء وزرا کی آمد و رفت کی وجہ سے لاہور خصوصاً مغلپورہ میں رہتی تھی وہ عنقا ہو گئی۔ عالیشان حویلیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور باغوں اور خیابانوں پر اداسی و افسردگی کا عالم تھا۔

فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں لاہور کی گورنری پر نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ فائز تھا۔ وہ چونکہ حضرت ایشاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس نے اپنی اقامت روضہ حضرت ایشاں کے قریب ہی پسند کی۔ اس کی بیگم کا نام بیگم جان تھا۔ اس نے ۱۱۳۹ھ میں مغل پورہ اور اس کے ملحقہ محلہ تہل پورہ کی زمین پر خوبصورت مکانات تعمیر کرائے۔ اور ایک باغ اور ایک خوشنما مسجد سے انکو رونق دی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ مغلپورہ کی جگہ اب لوگوں کی زبان "بیگم پورہ" کے نام سے آشنا ہو رہی تھی۔

بیگم پورہ کے مکانات ایک قسم کا گورنمنٹ ہوس تھے نواب

عبدالصمد خاں کے زمانہ سے لیکر آخری مسلمان گورنر نواب میر
معین الملک کے زمانہ تک بیگم پورہ کی آبادی اور رونق روز بروز
بڑھ رہی تھی۔ ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء جب احمد شاہ ابدالی نے
لاہور پر اپنا پہلا حملہ کیا ہے۔ اور نواب عبدالصمد خاں کے پوتے
شاہنواز خاں ربن زکریا خاں ناظم لاہور کو شکست دی ہے۔ تو
صرف اسی مغلپورہ اور بیگم پورہ نے اہل لاہور کو احمد شاہی لوٹ
سے بچایا تھا۔ تاریخ لاہور[۲] میں لکھا ہے۔ "تمام فوج ایک ہی دن
کی لوٹ میں اس قدر مالامال ہوگئی تھی۔ کہ اس کو لاہور کے
لوٹنے کی مطلق خواہش نہ رہی[۳]۔ علاوہ لوٹ اور غارتگری کے
بیگم پورہ میں ابدالی فوج نے دردناک قتل عام بھی کیا
سہ حاکمان لاہور[۴] کے زمانہ ۱۷۶۵ء لغایت ۱۷۹۸ء میں
سکھ غارتگروں نے تین مرتبہ اس محلہ کو بے چراغ کیا۔ درانی و

---

[۱] اس زمانہ میں سکھ غارتگروں کا بڑا زور تھا اس نے انکی واقعی گوشمالی کی سکھ
میر منو کہتے تھے۔ انکا ایک شعر نواب میر منو کے متعلق مشہور ہے

میر منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے
جیوں جیوں سانوں وڈھدا اسی دونے دونے ہوئے

[۲] مصنفہ رائے بہادر کنہیا لعل مطبوعہ ۱۸۸۴ء

[۳] احمد شاہ کی اسی لوٹ کے متعلق لاہور میں یہ پنجابی ضرب المثل ہوئی
کھادا پیتا لاہے دا، رہندا احمد شاہے دا

[۴] لہنا سنگھ۔ گوجر سنگھ جنکے نام پر محلہ گوجر سنگھ آباد ہی اور سوبھا سنگھ جو رنگی بادہ

افغانی فوجوں نے مکینوں کو لوٹا تھا۔ مگر مکانوں سے سروکار نہ رکھا تھا۔ سہ حاکمان لاہور اور ان کے جانشینوں نے بھی بچی کھچی دولت اور رہی سہی پونجی پر ہاتھ صاف کیا لیکن جب رنجیت سنگھ (۱۷۹۸ء لغایت ۱۸۳۹ء) کا عہد آیا۔ تو مکانات و محلات کی دیواریں اور بنیادیں تک ہل گئیں۔ تاریخ لاہور میں لکھا ہے۔ ناظمان لاہور کی زنانہ و مردانہ قبر دل پر لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تھیں۔ جن پہ سنگ مرمر کے علاوہ اور قیمتی قسم کا قیمتی پتھر لگا ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ نے تمام پتھر اتروا لیا

جب ۱۸۴۹ء میں انگریزی عہد آیا۔ تو بیگم پورہ کی جو دیواریں اور بنیادیں سکھوں کی دست برد سے بچ رہیں وہ محکمہ نزول میں منتقل ہو گئیں۔ اور نیلام ہو کر میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئیں۔

ناظمان لاہور کا قریباً تمام خاندان بیگم پورہ ہی میں مدفون ہے۔ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ ناظم اول۔ اس کے دو بیٹے نواب ذکریا خاں۔ اور نواب عبداللہ خاں دونوں نے یکے بعد دیگرے بیگم پورہ ہی کو دارالحکومت بنایا۔ ان کے بعد نواب ذکریا خاں کا بیٹا نواب شاہنواز خاں بھی بیگم پورہ ہی میں رہا۔ اور ہر ناظم نے جو اس زمانہ میں حفظ سلطنت کی وجہ سے بجائے خود

لہ اسی نواب عبداللہ کے متعلق مشہور ہے "حکومت نواب عبداللہ نہ چلی رہی نہ چولہا" وفات ۱۱۶۶ھ قبر اسکی مقبرہ سرو والا اور بیگم پورہ کے مشرق کی طرف ہے۔

پنجاب کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا بیگم پورہ کو بہت رونق دی۔
رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کے ایک فوجی افسر مہاں سنگھ خزانہ
لے اجڑے ہوئے بیگم پورہ کے گرد بہت سے درخت رکھ اور جنگل
کے طور پر لگا دئیے۔ اور یہ جگہ جہاں آبادی کی چہل پہل سے کھوے
سے کھوا چھلتا رہتا تھا۔ جہاں دولت کا مینہ برستا تھا اور جہاں
عالیشان عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ ایک بیابان سی نظر
آنے لگی۔ مہاں سنگھ خزانہ نے بھوگیوال اور باغبانپورہ کے چند
زمینداروں کو بیگم پورہ کے کھنڈرات پر آبادی وزراعت کا حکم
دیا۔ چنانچہ بہت سے کھنڈرات صاف ہو کر قابل زراعت زمین
پیدا کی گئی۔ خزانہ کے بعد مہاراجہ حکم سے گلاب سنگھ بھونڈیہ
نے خاص بیگم پورہ میں اپنا توپ خانہ قایم کیا۔ تمام درخت وغیرہ
کٹوا دئیے۔ اور اس مسجد کو جس کے لبننی۔ سبز اور کاسنی رنگ
کے نقش ونگار دو سو سال گذر جانے اور کئی صدمات دیکھنے کے
بعد بھی خوشنما اور تر وتازہ معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی آرام گاہ قرار
دیا۔ اس وقت وہ جگہ جو پہلے مغلپورہ اور پھر بیگم پورہ کے نام سے
مشہور رہی۔ اب "چھاؤنی گلاب سنگھ بھونڈیہ" کے نام سے شہرت
پذیر تھی۔ مسجد اب تک موجود ہے۔ درمیانی محراب کی پیشانی پر
وسط میں "افضل الذکر لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" شمال کی جانب
"عملو بالصلوۃ قبل الموت" اور جنوب کی سمت "عملو بالصلوۃ قبل
الفوت" لکھا ہے۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کا تھا۔ اب سنگ مرمر کی
جگہ سفید چونے نے لی ہے۔ مسجد کے سامنے ہی اس باغ کے آثار

بھی نظر آتے ہیں۔ جو بیگم پورہ کی بنا کے ساتھ ہی نواب بیگم جان نے آباد کیا تھا۔

جب راجہ سنسار چند کوہستان کانگڑہ سے اسیر ہو کر لاہور آیا۔ تو رنجیت سنگھ نے بیگم پورہ اس کی جاگیر میں کر دیا۔ ۱۸۷۵ بکرمی میں۔ جس کو آج ۱۰۶ سال کا عرصہ گزرتا ہے۔ راجہ سنسار چند نے یہ گاؤں اپنے برہمنوں کو بخش دیا۔ اس زمانہ میں اسکا مالیہ ایک سو روپیہ سالانہ تھا۔

لہنا سنگھ مجیٹھیہ سکھوں کے زمانہ میں ایک نامی سردار تھا۔ اس کے بیٹے دیسہ سنگھ نے کوہستان میں برہمنوں کو ایک سو روپیہ کا گاؤں دیکر بیگم پورہ پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اور وہ شاہی محلات وہ عالیشان مسجد وہ فرحت بہار باغ۔ بیگم پورہ کی وہ فصیل اور چار دیواری جس کے غرب رویہ ایک وسیع بازار تھا۔ جہاں اس قدر دولت تھی۔ کہ درانی فوجوں نے یہاں کی لوٹ کے بعد لاہور کو لوٹنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک سو روپیہ کی ذلیل قیمت پر دست بدست فروخت ہوتا گیا

ڈیوڑھی (بیگم پورہ) کا عالیشان دروازہ اس قدر بلند ہے کہ ہاتھی معہ ہودج بڑی آسانی سے اس میں گزر سکتا ہے دروازہ کے چوبی طاق جو لوہے کی کثرت سے حملۂ دشمن کے لئے ڈھال کا کام دیتے تھے۔ سکھا شاہی زمانہ میں "بدست بچگاں" کی نذر ہو گئے۔

نواب غازی نواب عبد اللہ ناظم لاہور کا پوتا جو مقتول الی الآخر

اور سکھوں کے خوف کی وجہ سے کہیں باہر چلا گیا تھا۔ سکھوں کے دور آخر میں لاہور آیا۔ خاص شہر میں آبا و اجداد کے کچھ مکانات تھے۔ کچھ عرصہ تک ان کی ہڈیاں بیچ بیچ کر گزارہ کرتا رہا۔ جب سرکار انگریزی کا عمل دخل ہوا۔ تو بیگم پورہ کی ملکیت کا دعوے کیا۔ مگر اپنی بے زری و مفلسی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اسی حسرت میں ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے ایک سال پیشتر مر گیا۔

اب اس موضع پر مہر قادر بخش کا قبضہ ہے۔ اور اس کا سالانہ مالیہ چار پانچ روپیہ کے قریب ہے۔ مردم شماری ڈیڑھ سو آدمیوں کی ہے۔ اور یہ سب لوگ بیگم پورہ کی ٹوٹی پھوٹی فصیل اور اس کی شکستہ عمارت کے اندر رہتے ہیں

بیگم پورہ اور اس کے کھنڈرات شالامار باغ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر روضہ حضرت ایشاں کے قریب میں واقع ہیں یہ عمارتیں سڑک شالامار باغ سے صاف نظر آتی تھیں۔ اب پنجاب ٹیکنکل کالج کی وسیع و کثیر عمارات نے ان کو نظروں سے بہت کچھ اوجھل کر دیا ہے۔

ملکۂ لاہور

نواب معین الملک عرف میر منو داماد نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ، محمد شاہ کی طرف سے ۱۷۴۷ء میں پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے وہ نہایت تندہی اور شجاعت سے روکتا رہا۔ لیکن ۱۷۵۲ء میں رسد رسانی کی قلت سے تنگ ہو کر اس نے احمد شاہ کے ساتھ شالامار باغ میں صلح کی شرائط طے کیں۔ اور پچاس لاکھ نقد اور کچھ ہاتھی گھوڑے معہ ساز و سامان دیگر سوا لاکھ کا خلعت لیا۔ اور جالندھر۔ لاہور اور کوہستان کی سند حکومت حاصل کی۔

اس زمانہ میں سکھوں کی غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ رعایائے پنجاب ان ناخدا ترسوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھی۔ میر منو ان کی گوشمالی اور سرزنش کے لئے قصور کی جانب روانہ ہوا۔ اور ان کو وہ سزا دی۔ کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخیں ان خونی اوراق سے بھری پڑی ہیں۔ وہ فتح یابی کے بعد ایک دن شکار کو جا رہا تھا۔ کہ گھوڑی سیخ پا ہو گئی۔ اور اس طرح بھڑکی۔ کہ نواب کی جان عزیز اسی صعوبت میں قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۱۷۵۴ء کا ہے

میر منو کا ایک لڑکا امین الدین خاں اس وقت تین سال کا تھا۔ اس کی ماں مراد بیگم نے سکھوں کی لوٹ مار اور احمد شاہ

بادشاہ دہلی کی پست ہمتی کے واقعات اپنے امرا کو بتا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور بیٹے کو حکومت پنجاب کا والی قرار دیکر آپ اسکی سرپرست بنی۔ قدرت سے چھ ماہ بعد وہ لڑکا بھی چیچک سے انتقال کر گیا اب مراد بیگم کے لئے بڑی مشکل تھی۔ نہ وہ حکومت چھوڑ سکتی تھی۔ اور نہ اسے اپنے حکمران رہنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی نواب قمرالدین خاں وزیر کی بیٹی تھی۔ محلوں میں پلی تھی ان چالوں سے واقف تھی۔ جن سے بادشاہ تخت پر بٹھائے جاتے اور اُتارے جاتے ہیں۔ لکھی پڑھی تھی۔ اپنے بیٹے کی سرپرستی کے زمانہ میں بعض احکام اپنے ہاتھ سے لکھتی تھی۔ نہایت معاملہ فہم اور زیرک تھی۔ اس لئے بیٹے کی موت سے جو پریشانیاں لاحق ہوگئی تھیں۔ ان کے باوجود بھی اس نے اپنے رعب داب اور شاہانہ تجمل میں فرق نہ آنے دیا۔ امرائے دربار کو اس نے بلایا اور سمجھایا۔ کہ میں عورت ذات۔ پردہ میں بیٹھنے والی ہوں۔ برائے نام مجھے اپنا حکمران بنالو۔ تاکہ نواب کے گھر کی عزت بنی رہے حکم احکام در اصل تم ہی لوگوں کے ہونگے۔ اگر کوئی اور صوبیدار آگیا۔ تو خدا جانے تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ امرا نے بھی سمجھا کہ بیگم بات ٹھیک کہتی ہے۔ عمل و خل سب ہمارے ہی قبضہ میں رہیگا۔ اس کو برائے نام حکمران سمجھنے میں ہمارا کیا ہرج ہے۔ غرض اس طرف تو اس نے اپنے شوہر کے امراء و رفقاء کو اپنی رفاقت میں رکھا۔ اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی۔ اور اس کے ہمنام مگر پست ہمت بادشاہ دہلی احمد شاہ تیموری کے

درباروں میں نہایت خفیہ طور پر اپنے وکیل اور ایلچی بھیجے تاکہ باضابطہ سندِ حکومت ملنے پہ مجھے امرائے دربار کا محتاج نہ رہنا پڑے۔

لاہور اس زمانہ میں دو ملاؤں میں ایک مرغی کی مثال تھا۔ احمد شاہ درانی کو فاتح ہونے کی حیثیت سے لاہور پر دعوے تھا اور احمد شاہ تیموری اسے اپنا موروثی ملک سمجھ رہا تھا احمد شاہ درانی نے تو اس خیال سے مراد بیگم کو سندِ حکومت لکھ دی کہ اس کے شوہر نواب معین الملک نے میری اطاعت قبول کر لی تھی اور احمد شاہ دہلی نے اس لیے پروانہ لکھ دیا کہ وہ اپنے آپ کو دربار دہلی کے ماتحت سمجھ رہی ہے یہی غنیمت ہے

غرض۔ اس ہشیار عورت نے دونوں درباروں سے عطائے حکومت کے فرمان حاصل کر لیئے۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ پاؤں اچھی طرح جم گئے ہیں۔ اور حکومت نے اقتدار حاصل کر لیا ہے تو اس نے بعض امور میں امرائے دربار کا دخل کم کرنا شروع کر دیا اور کوئی حاکم یا امیر اپنے سابقہ اختیارات سے کوئی حکم جاری کرتا۔ تو بیگم اس کو فوراً منسوخ کر دیتی۔ اور اس پر سختی سے نوٹس لیتی۔

امراء نے اپنی یہ ذلت دیکھ کر بیگم کے خلاف وسیع پیمانہ پر ایک سازش کی۔ جس میں یہ قرار پایا کہ بیگم کو تختِ لاہور سے اُتار کر اپنے گروہ میں سے کسی کو حاکم لاہور بنا لیں۔ اور بادشاہ کو اس واقعہ کی دہلی میں اطلاع دیدیں۔ ابھی یہ سازش عالم وجود میں نہ آئی تھی۔ کہ بیگم کو خبر ہو گئی۔ اس نے بظاہر تو

کسی کو کچھ نہ کہا۔ لیکن ان امراء کو وہ سزا ضرور دینا چاہتی تھی۔ اس لیئے اس نے احمد شاہ ابدالی کے پاس اپنے ایلچی بھیجے۔ اور ایک مفصل عریضہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ کہ میرے شوہر کے امراء دربار مجھے عورت ذات سمجھکر میری جان کے درپے اور اپنے میں سے کسی کو پنجاب کا خود مختار بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نہایت شکر گزار ہونگی۔ اگر بادشاہ اپنے دربار کا کوئی قابل اور معتمد اہلکار میری حفاظت اور میری نیابت کے لیئے کابل سے روانہ کردے۔ احمد شاہ ابدالی نے دربار کابل کے ایک نامی امیر سردار جہان خاں کو کچھ فوج دیکر بیگم کی نیابت میں کام کرنے کے لیئے لاہور روانہ کر دیا۔

جہان خاں کے آنے پر بیگم نے امراء کا زور اور بھی کم کرنا شروع کر دیا۔ نواب میر بھکاری خاں رستم جنگ بانی مسجد طلائی لاہور سے جو بیگم کے دربار کا امیر الاعظم تھا۔ بیگم بہت خائف تھی۔ کیونکہ شہر میں اس کا رسوخ و اقتدار حد درجہ کا تھا۔ اور مدار المہامی کا عہدہ بھی اسی کے سپرد تھا۔ بیگم نے کسی بہانہ سے اسکو محلات میں بلوایا۔ اور جہان خاں کے روبرو اس کی کمال بے عزتی کرکے اپنی لونڈیوں کے ہاتھ سے اسے سولی دلوا دی۔

دار الخلافہ کے امیر الامراء اور پنجاب کے مدار المہام یہ کیفیت دیکھکر تمام امیروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور سب نے سرکاری امور میں دخل دینا چھوڑ دیا۔ اور خانہ نشینی اختیار کر لی۔

امراء کی خانہ نشینی یا خاموش مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھوں

نے پھر پرپرزے نکالے۔ وہ علاقوں کے علاقے لوٹ لیتے زمینداروں سے معاملہ تک زبردستی وصول کر لیتے۔ جہاں خاں بہت کچھ انتظام کرتا۔ مگر اس کی قابلیت فوجی کاموں تک ہی محدود تھی۔ انتظامی اور مالی امورات کی انجام دہی بغیر اہلکاروں کے مشکل تھی۔ اور وہ سب جان و آبرو کی حفاظت کے لئے اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے تھے۔ ملک کی بدانتظامی اور سکھوں کی لوٹ مار کے متعلق امرائے خانہ نشین نے آخر ایک عریضہ بادشاہ دہلی (احمد شاہ تیموری) کی خدمت میں لکھا۔ بادشاہ نے غازی الدین خاں اپنے وزیر کو جو نظام اول دکن کا پوتا تھا۔ کچھ سپاہ دیکر لاہور بھیجا۔ وہ ابھی جالندھر کے علاقہ ہی تھا۔ کہ مراد بیگم نے پوشیدہ طور پر اپنا ایک وکیل وزیر موصوف کے پاس روانہ کیا۔ اور یہ پیغام بھیجا۔ کہ اگر پنجاب کی حکومت میرے نام واگذار رہے۔ تو میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کر دونگی۔ چنانچہ وزیر کی منظوری کے بعد مراد بیگم اپنی بیٹی۔ لشکر اور سامان کے ساتھ لاہور سے روانہ ہو گئی۔ اس وقت وزیر (غازی الدین خاں) ماچھی واڑہ میں مقیم تھا۔ اسی جگہ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ اور دو ماہ تک وزیر دلہن کے ساتھ اسی مقام پر عیش و عشرت میں مصروف رہا۔

غازی الدین خاں واپس دہلی جاتے ہوئے اپنا ایک معتبر افسر

لہ مراد بیگم رشتہ میں وزیر غازی الدین خاں عماد الملک کی پھوپھی تھی

سید جمیل الدین نامی بیگم کی نیابت میں چھوڑ گیا۔ بیگم کی یہ کیفیت دیکھکر جہان خاں، احمدشاہ ابدالی کا معتبر لاہور چھوڑ کر کابل چلا گیا تھا جمیل الدین اپنا اقتدار چاہتا تھا۔ اور بیگم اپنے مقابلہ میں کسی اور اقتدار ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ آخر دونو میں اَن بَن ہو گئی۔ بیگم نے اپنے داماد غازی الدین سے جمیل الدین کی شکایت کی مگر اس نے چنداں پروانہ کی۔ بیگم نے مایوس ہو کر احمدشاہ ابدالی کو خط لکھا۔ چنانچہ احمدشاہ ابدالی کا چوتھا حملہ جو لاہور اور پنجاب پر ہوا ہے۔ وہ اسی بیگم کی دعوت کا نتیجہ تھا۔

دہلی میں جب بیگم کی اس سازش کا حال معلوم ہوا تو غازی الدین خاں نے مرزا آدینہ بیگ حاکم جالندہر کو لکھا۔ کہ کسی ترکیب سے بیگم کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دو۔ اپنے چند سردار بھی لاہور بھیجے کہ وہ خفیہ طور پر اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہیں۔ آخر لونڈیوں اور خواجہ سراؤں کی معرفت اس وقت جبکہ بیگم خواب استراحت میں تھی۔ گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دی گئی۔ بیگم نے اپنے گرفتار کنندگاں اور نواب آدینہ بیگ وغیرہ کو کہا۔ کہ جب احمدشاہ کو میری گرفتاری کا حال معلوم ہو گا۔ تو یاد رکھو۔ ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیگا۔ اور ہر طرف خون کی ندیاں بہتی نظر آئینگی۔ لیکن ایسے وقت میں ایسی باتیں کون سنتا ہے۔ چنانچہ بیگم تو دہلی پہنچا دیگئی۔ اور آدینہ بیگ کو اس خدمت کے صلہ میں غازی الدین نے لاہور کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

اس واقعہ کے تھوڑے دنوں کے بعد غازی الدین خاں عماد الملک

نے مولویوں اور مفتیوں سے بادشاہ کی معزولی کے فتوے لکھوا کر احمد شاہ کو تخت سے اُتار دیا۔ اور شہزادہ محمد معزالدین کو عالمگیر ثانی کا خطاب دیکر بادشاہ نامزد کر دیا۔

جب مراد بیگم کا رقعہ (عماد الملک غازی الدین وزیر شاہ دہلی کی زیادتیوں کا) احمد شاہ ابدالی کو ملا۔ تو وہ مہم قندہار میں معروف تھا، وہاں سے فارغ ہو کر وہ عازم پنجاب ہوا۔ اور ۱۷۵۶ء کے موسم سرما میں لاہور پہنچ گیا۔ اس وقت دہلی میں عالمگیر ثانی۔ اور لاہور میں نواب آدینہ بیگ[1] کی حکومت تھی۔ آدینہ بیگ بھاگ گیا

---

[1] لاہور پر ۱۷۵۸ء میں کچھ عرصہ کے لئے مرہٹوں کا قبضہ بھی ہو گیا تھا مرہٹے ادہر ملتان تک اور سرحد کی طرف اٹک تک حکومت کرتے تھے۔ سکھ کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اور دُرّانی ہٹتے ہٹتے اٹک پار چلے گئے تھے مرہٹوں کے زمانہ میں بھی آدینہ بیگ ہی پنجاب کا صوبہ دار مقرر ہوا آخر مرہٹے اس سے ۷۵ لاکھ نذرانہ لیکر دکن کو واپس چلے گئے۔ نواب آدینہ بیگ نے بڑھاپے میں بہت عروج حاصل کیا۔ وہ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ صوبہ پنجاب کا زمانہ دیکھے ہوئے تھا۔ اس کا پنجاب پر بڑا اثر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اپنا اقتدار زیادہ عرصہ تک قایم نہ رکھ سکا۔ اور ۱۷۵۸ء ہی انتقال کر گیا۔ آدینہ نگر (موجودہ نام دینا نگر) جو ضلع گورداسپور میں ہے۔ اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس کی قبر گوجرانوالہ میں بتائی گئی ہے (تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف)

اور بادشاہ نے سیدھا دہلی کا رُخ کیا۔ جب دہلی بیس میل رہ گئی تو غازی الدین بہت گھبرایا۔ اس اضطراب و پریشانی میں اپنی ساس اور پھوپھی مراد بیگم کی یاد آئی۔ گو وہ عزت کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر بادشاہی اسیروں میں تھی۔ مراد بیگم سے غازی الدین نے کوئی اچھا سلوک نہ کیا تھا۔ تاہم یہ وقت ایسا تھا کہ اسے مجبوراً اس کے پاس جانا پڑا۔ اور اس کی منت خوشامد کرکے احمد شاہ دُرانی دربار میں اس کو اپنا وکیل و شفیع بنایا۔ چنانچہ بیگم کی سفارش سے اس نے اپنی تقصیر بھی معاف کرالی۔ اور سجانی عہدہ کے علاوہ اپنی قدر و منزلت بھی پہلے سے زیادہ بڑھالی

اسی حملہ میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو دو ماہ تک لوٹا۔ اور محمد شاہ کی بیٹی سے اپنی۔ اور اس کی ایک بھتیجی سے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی کردی۔ اس واقعہ کے بعد تاریخ میں مراد بیگم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دہلی میں گمنامی کی حالت میں انتقال کر گئی تھی۔

مکمل تاریخ کشمیر (عہد اسلامیہ)

جس میں سلاطین کشمیر کے جلیل القدر عہد حکومت کو بہ وضاحت قلمبند کر کے ۵۰۰ سالہ اسلامی عہد حکومت کی مفصل تاریخ درج کیگئی ہے۔ کشمیر عروج و زوال کا یہ صحیح مرقع آپکو بتادیگا۔ کہ کشمیر میں اسلام کسطرح پھیلا۔ کس طرح بڑھا۔ اور کس طرح تخت و تاج اس کے قبضے میں آیا اور پھر کیا اسباب تھے۔ کہ وہ لوگ جو اپنے ملک (کشمیر) سے باہر نکل کر ہندوستان۔ لنکا ماورالنہر کاشغر اور تبت و چین تک مار دھاڑ کرتے تھے۔ اس قابل بھی نہ رہے۔ کہ ممالک غیر کی فتوحات تو کجا اپنے ملک کی حفاظت ہی کر سکتے (حکومت سکھاں) اس حصہ میں سکھوں کی ۲۷ سالہ حکومت کشمیر کا ذکر ہے جسمیں مسلمانوں کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ کوئی مسلمان آزادی و جراءت کے ساتھ احکام شریعت کی بجاآوری بھی نہ کر سکتا تھا۔ سکھ حکومت کی باہمی سازشیں اور خانہ جنگیاں اور بھی قابل عبرت ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ عہ/۱ حجم ۴۰۴ صفحہ مجلد

غنی کاشمیری

ملک الشعراء تذکرہ کشمیر (منظ[illegible])

علامہ محمد طاہر غنی کاشمیری [illegible] حریت پسند شاعر تھا جس نے کبھی کسی بادشاہ وزیر یا رئیس کی خوشامد نہ کی۔ اور پھر بھی بادشاہ اور گورنر قدر کرتے تھے یہ عدیم النظیر شاعر شاہ جہان کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اس زمانہ کی فارسی شاعری اور علامہ غنی کے عجیب حالات کے علاوہ ہمعصر شعرا کا تذکرہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مولفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔

قیمت آٹھ آنہ (۸/)

ظفر برادرس تاجران کتب لاہور سے طلب فرمایئے

مُلادوپیازہ

دربار اکبری کے مشہور ظریف ملادو پیازہ کی سوانح عمری اور راجہ بیربر سے اس کی دو دو چونچیں عجب پُر لطف کتاب ہے۔ قیمت ۴ر

محب وطن خواتین ہند

جس میں ۳۲ ہندو مسلمان سکھ اور پارسی محب وطن خواتین ہند کے حالات سوانحات عمر اور ملکی جذبات سے لبریز خیالات ولولہ انگیز اور موثر پیرایہ میں درج ہیں۔ جنہوں نے اپنے ملک و ملت کو غلامی سے ابدی نجات دلانے کے لئے ہر مصیبت ہر مشکل اور ہر تکلیف میں راحت تصور کی ہے۔ بلکہ اپنے بھائیوں بیٹوں اور خاوندوں کے جیل میں جانے اور ان کے زبان بند و نظر بند ہونے کو ملک کی دائمی آزادی کا ذریعہ سمجھا ہے قیمت...... (۸ر)

سعد زاغلول پاشا

جس میں مشہور مصری محب وطن رئیس الاحرار مصر سعد زاغلول پاشا کی ملکی و قومی خدمات کے کارنامے اور اس کی پولیٹکل زندگی کے حیرت انگیز واقعات عرابی پاشا محمد بک فرید عبداللطیف بک الہر شیخ محمد عبدہ جیسے فداکاران ملت اور بیگم زاغلول پاشا صفیہ خانم اجیسی آزادی حق گو اور جوان ہمت و شیر دل عورت کی جانبازانہ جدوجہد کے علاوہ سیاسیات مصر کے متعلق بھی دلچسپ کوائف درج ہیں۔ قیمت...... (۱۰ر) دس آنہ

غنی کاشمیری

فخر کشمیر و سند ملک الشعراء علامہ محمد طاہر غنی کاشمیری وہ حریت پسند شاعر تھا۔ جس نے کبھی کسی بادشاہ وزیر یا رئیس کی خوشامد نہ کی اور پھر بھی بادشاہ اور گورنر قدر کرتے تھے۔ یہ عدیم النظیر شاعر شاہ جہان کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اس زمانہ کی فارسی شاعری اور علامہ غنی کے دلچسپ حالات کے علاوہ ہمعصر شعرا کا تذکرہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ (ا مولنٰہ مولانا اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی۔ قیمت...... (۸ر)

ملنے کا پتہ:۔ ظفر برادرس
تاجران کتب ظفر منزل لاہور

مکمل تاریخ لاہور

اس کے مندرجہ ذیل پانچ حصے ہیں۔ لاہور قدیم جسمیں لاہور کی ابتدا اسکی وجہ تسمیہ
قدیم ہندو راجگان لاہور کے حالات پھر غزنویوں اور غوریوں اور انکے بعد کے مسلمان بادشاہوں
کی حکومت۔ ان حکومتوں کا پنجاب اور لاہور پر اثر۔ زیر طبع۔ قیمت ۸/ حصہ دوم شباب لاہور
(یا لاہور عہد مغلیہ میں) بابر سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ یعنی سوا دو سو سال تک لاہور کے شاہی
باغات و عمارات۔ اندرون و بیرون شہر کی رونق۔ آبادی اور کثرت تمول و فارغ البالی
سے جو عروج و شباب حاصل رہا ہے۔ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کے علاوہ اکبر جہانگیر شاہجہان اور اورنگزیب
اور شاہ عالم بہادر شاہ نے جسکے نام پر شاہ عالمی دروازہ اب تک قائم ہے۔ لاہور کو عروس البلاد
بنانے میں جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اسکی مفصل کیفیت عہد مغلیہ کے عدل و انصاف اور مغل
گورنران لاہور کے دلچسپ لطائف۔ اس زمانہ کے علما شعرا امراء وزراء اور شہر اولیاء کے حالات
قیمت صرف عہ/ زوالِ لاہور۔ شاہ عالم اول کے بعد دولت مغلیہ کے زوال کے ساتھ
ہی ترقی لاہور کا کمال بھی ختم ہو گیا (۱۷۳۹ء) یا نادر شاہی حملہ سے لیکر مہاراجہ رنجیت سنگھ
کے قبضہ لاہور (۱۷۹۸ء) تک سکھوں۔ ایرانیوں اور کابلیوں نے لاہور میں جو غارت گری کی ہے
اور بیرون شہر کی آبادی پر جو ستم ڈھایا ہے۔ اسکی دردناک کیفیت ۸/ حصہ چہارم لاہور اور
سکھ حکومت۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد (۱۷۹۸ء) سے لیکر ۱۸۴۹ء یعنی زمانہ الحاق
پنجاب تک کے حالات۔ دربار لاہور۔ فوج خالصہ۔ خاندان شاہی اور امرائے دربار
کے حیرت انگیز حالات۔ باغات لاہور کی پر فضا کیفیت جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں یا اس کے
بعد مہاراجہ کھڑک سنگھ مہاراجہ شیر سنگھ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے زمانہ میں ۱۸۴۹ء تک لاہور میں بنائے گئے
قیمت عہ/ حصہ پنجم لاہور جدید جس میں عہد سلطنت انگلشیہ میں لاہور کو جو علمی و تمدنی ترقی اور جو
فارغ البالی و وسعت نصیب ہوئی ہے۔ اس کا مفصل ذکر ہے۔ قیمت ۸/ کل قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ:۔ ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور

مشہور عالم پریس لاہور

شالامار باغ

بحسنِ سعی کارپردازان پیسہ اخبار

محمد الدین فوق

خادم التعلیم برقی پریس لاہور

ظفر برادرس تاجرانِ کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلہ کتب

تاریخ

شالامار باغ

جس میں

لاہور کے شاہی شالامار باغ اس کے شاہی ایوانات اور شاہی جلسہ گاہوں اور سیر گاہوں کی اثر پذیر کیفیت کے علاوہ یہ بتایا گیا ہے۔ کہ شاہانِ مغلیہ کے بعد نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں۔ سکھ حاکمانِ لاہور کی بے استقلال حکومت اور رنجیت سنگھ اور اس کی اولاد نے اس عدیم النظیر باغ اور اس کے ایوانات کے ساتھ کس قسم کا بے رحمانہ سلوک کیا ہے۔ اسی ضمن میں کمال محنت و تفتیش سے کشمیر، دہلی اور پنجاب کے آٹھ اور باغہائے شالامار کے دلچسپ کوائف اور حضرت مادھو لعل حسین کے سوانحات عمر اور باغبانپورہ کے تاریخی حالات نہایت دلکش نادر اور حیرت انگیز پیرایہ میں درج ہیں۔

مرتبہ

محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور

۱۹۲۴ء

سلسلہ جدید ایڈیشن اول — قیمت فی جلد

مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لاہور باہتمام منشی رحیم بخش صاحب پرنٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

"سیر شالامار باغ" کا سب سے پہلا ایڈیشن میں نے ۲۰ فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو لکھا۔ اس وقت اس کا حجم ۲۰ صفحوں سے زیادہ نہ تھا۔ اور یہ صرف دو تین دن تک تواریخ ہائے لاہور وغیرہ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ چونکہ نئی بات اور نئی چیز تھی اخبارات نے اس پر حوصلہ افزا ریویوز لکھے اور مؤلف کی جدت طرازی کی داد دی۔ پبلک نے بھی قدردانی کی اور میلہ شالامار باغ (اخیر مارچ سنہ ۱۹۱۰ء) کے ایام ہی میں یہ مختصر سا پمفلٹ ختم ہو گیا۔ اس ایڈیشن کے متعلق میرے دوست قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل آف گولیکی حال ایڈیٹر "تشحیذ الاذہان" قادیان نے دو تاریخی قطعات لکھے۔ ایک ہجری میں جس کا آخری شعر حسب ذیل ہے ؎

ہوئی اکمل کو جب تاریخ کی فکر کہا فی الفور ہے تاریخ اکمل

دوسرا قطعہ سنہ عیسوی میں تھا جس کے طویل ۱۵ شعروں میں سے صرف آخری شعر لکھا جاتا ہے ؎

از سر اخلاص یہ تاریخ اکمل نے کہی فوق نے چھپوایا اچھا حال شالامار باغ

نقش ثانی میں نے ۲ فروری سنہ ۱۹۱۱ء کو ترتیب دیا۔ یہ بہرحال نقش اول سے بہتر تھا۔ اس میں قریباً ان تمام عمارات[1] کا ذکر تھا جو شالامار باغ کو جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف آتی ہیں۔ اور اپنے بلند گنبدوں عالیشان دروازوں اور شکستہ و بوسیدہ

[1] مثلاً بدھو کا آوا۔ گلابی باغ۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں۔ مقبرہ نواب خاں دوران۔ مقبرہ سرو والا۔ مقبرہ حضرت ایشاں۔ بیگم پورہ اور لاہور کے بعض اور تاریخی باغات کے حالات (اب ان سب کا ذکر مزید "سرگذشت لاہور" میں درج ہوگا)

دیواروں اور ٹوٹے ہوئے محرابوں اور چبوتروں اور اپنی عجیب و حیرت انگیز صنعت کاری کی وجہ سے ہر راہرو ہر ناظر اور ہر صاحبدل کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ نقش ثانی میں اس مختصر سی کتاب کا حجم بہت سے اضافہ کی وجہ سے ۸۰ صفحہ سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اخبارات کے علاوہ پنجاب اور یو۔پی کے نامی شعراء نے قطعات تاریخ بھی لکھے جن میں ڈاکٹر سر محمد اقبال[1] صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی بیرسٹرایٹ لاء لاہور کا قطعۂ تاریخ حسب ذیل ہے

حسنِ سعیٔ فوق را صد مرحبا — ہست ہر سطر کتابش دلربا
از سر نازش بپئے تاریخ او — مے سزد تصویر باغ جانفزا

منشی محمد احسان علی خاں صاحب احسان[2] شاہجہانپوری نے جن کا افسوس ہے کچھ عرصہ سے انتقال ہو چکا ہے اپنے ۲۲ فروری سنہ ۱۹ء کے خط میں تین شعروں کا حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال فرمایا

فوق نے تحریر کی تاریخ شالامار باغ — ہر ورق میں ہے شباہت صفحۂ گلزار کی
دوسری بار اسکے چھپنے کا ہوا ہے اہتمام — خوبیاں ظاہر ہیں سب حاجت نہیں اظہار کی
سیر اول کر چکے احسان لیکن ہر سال — اب بہار حال دیکھو باغ شالامار کی۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے میں نے تیسرا ایڈیشن چھاپا۔ اور اس کے بعد حکیم رام کشن صاحب اس کو قریباً ہر دوسرے تیسرے سال چھاپتے رہے اور اب تک غالباً اس کتاب کے چودہ پندرہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن نہ کبھی انہوں نے نیا ایڈیشن چھاپنے کے لئے مجھے مطلع کیا اور نہ مجھے اس کے چھپنے کی کبھی اطلاع ہو سکی

[1] اس زمانہ میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اور ایم۔اے کے سوا کوئی ڈگری یا خطاب آپ کے نام کے ساتھ نہ تھا۔ اور پروفیسر اقبال کے نام سے مشہور تھے ۔

[2] حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی مرحوم کے نامور بلکہ قابل فخر شاگردوں میں سے تھے ۔

اس طرح سنہ ۱۹۰۲ء کی تصنیف میں سنہ ۱۹۲۲ء تک کوئی معتدبہ اضافہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ کثرت مطالعہ نے جو نئے حالات بتائے تھے ان کی وجہ سے ہمیشہ اس میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت رہتی تھی *

بیس سال کے بعد سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک خط نے مجھے سیر شالامار باغ پر پھر ایک نظر ڈالنے کی تحریک کی۔ یہ خط میرے دوست مسٹر محمد منیر قریشی بی اے لائبریرین آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ شملہ نے مجھے ۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء کو شملہ سے لکھا جبکہ میں گلگشت کشمیر میں مصروف تھا۔ اس خط کا جو حصّہ شالامار باغ کے متعلق ہے اُس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے :۔ "ماہ ستمبر حال کے پرچہ (نذیرہ) آرکیالوجیکل میں جو سر رچرڈ ٹیمپل کی ادارت میں چھپتا ہے۔ اور جس میں ہندوستان پر مختلف عالموں کے مضامین چھپتے ہیں۔ ایک فہرست ان کتب کی جو ہندوستان کی اسلامی عمارات کے متعلق معتبر تاریخی اور روایتی معلومات بہم پہونچاتی ہیں۔ چھپی ہے۔ اور اس فہرست میں شہر لاہور کے تحت میں جن دس چیدہ کتابوں کے نام چھپے ہیں اُن میں ہندوستانی مصنفین میں سے صرف دو صاحبوں کے نام اور اُنکی تصانیف کا ذکر ہے۔ اول تو سید محمد لطیف صاحب اور ان کی تاریخ لاہور کا۔ دُوسرے جناب کا اور جناب کی تصنیف سیر شالامار باغ کا۔ باقی آٹھ تصنیفات ڈاکٹر ووکل۔ اینڈریوز۔ ایون۔ ہنری کوپ۔ کپلنگ۔ اور ٹامسن صاحب سابق چیف سکرٹری پنجاب کی ہیں۔ اس امتیاز و اعزاز پر آپ جسقدر فخر کریں بجا ہے۔ اس فہرست کی ترتیب مصر سے ایک انگریز بنام "کپٹن کرسول" کر رہے ہیں۔ اور وہی اسے اس رسالہ میں چھپوا رہے ہیں" *

اس خط کے بعد مجھے "سیر شالامار باغ" کے مطالعہ کی از سر نو ضرورت محسوس ہوئی اور جب میں نے اپنی سنہ ۱۹۰۱ء کی تصنیف کو سنہ ۱۹۲۲ء میں دیکھا تو وہ نئے معلومات اور جدید مطالعہ اور نئی ترتیب و تنظیم کے خیالات کے سامنے بالکل بے حقیقت نظر آئی۔ نومبر سنہ ۱۹۲۲ء اور جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کے اکثر ایام نئے حالات دریافت

کرنے کے لئے میں نے شالامار باغ کے علاوہ لاہور کے اور کئی مقامات بلکہ مضافات بھی گذارے۔

شاعر کہتا ہے "دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی" اور پھر نتیجہ اور انجام بتاتا ہے "عمر کیسے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی"۔ لیکن ان ایام میں میری یہ حالت تھی کہ دن تو آثار قدیمہ مقابر عالیہ مساجد واسعہ اور عمارات رفیعہ کی گرداوری میں جو جسم کو تھکاتی دل کو زندہ اور روح کو تازہ رکھتی تھی۔ کٹتا تھا۔ اور رات ان کتابوں کے مطالعہ میں بسر ہوتی تھی جو زبان بے زبانی سے لاہور کی تاریخی دلچسپیاں اور شاہان سلف کا ذکر محمود اور لٹیرے بونڈا کو حاکموں کی سنگدلی و بے دردی کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ بعض اوقات رات کے دو دو بجے تک میرے پلنگ کے پس و پیش کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ ترمیم و تنسیخ یہاں تک ہوئی۔ اور نئے معلومات و مطالعہ نے اضافہ اس قدر کیا۔ کہ کتاب کی شکل ہی بدل گئی۔ کتاب کا حجم جو پہلے ۰۰ صفحہ تک تھا۔ اب بڑی تقطیع کے تین سو صفحہ تک پہنچ گیا۔

اب یہ کتاب صرف شالامار باغ کی تاریخ ہی نہیں تھی۔ بلکہ لاہور کے قدیم باغات پرانے مکانات۔ مزارات اور مذہبی مقامات کی جن میں سے اکثروں کا یہ حال ہے کہ ان کی داستان تک بھی نہیں ہے داستانوں میں۔ عبرت انگیز اور آنکھوں سے آنسو نہیں خون رلا دینے والی سرگذشت اور دردناک اور الم افزا تصویر تھی۔

اس ترتیب و تنظیم میں قریباً ۹ ماہ صرف ہوئے۔ چونکہ کتاب کا حجم بہت زیادہ ہو گیا تھا بلکہ آثار قدیمہ کے حالات کی وجہ سے نفس مضمون ہی بدل چکا تھا۔ اور تاریخ شالامار باغ جو اصل بنیاد تھی اس کتاب کا ایک ضمیمہ معلوم ہوتی تھی۔ اسلئے شالامار باغ کی تاریخ کا حصہ اس میں سے الگ کر لیا گیا جس میں حسب ذیل مضامین کا اندراج ہے:-

(۱) تاریخ شالامار باغ لاہور

(۲) لاہور کے علاوہ دیگر مقامات کے شالامار باغ

(۳) حضرت مادھو لال حسین کے سوانحات عمر جن کے عرس کی وجہ سے یہ میلہ میلہ

چراغاں اور میلہ شالامار باغ کہلاتا ہے ٭

(۴) باغبانپورہ کے تاریخی حالات جہاں مزار حضرت مادھو لال حسین واقع ہے۔ اور جس کے بانی کی اولاد کے قبضہ میں شاہجہان کے زمانہ سے اب تک شالامار باغ کی عنانِ خدمت و حفاظت چلی آتی ہے ٭

۱۹۲۳ء کے ایڈیشن میں شالامار باغ کے متعلق علاوہ چشم دید حالات کے جن کتابوں اور تاریخوں سے مدد لی گئی ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱۔ تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ جج محمد لطیف مرحوم مطبوعہ ۱۸۹۲ء

۲۔ سفرنامہ ولیم مورکرافٹ انگریزی مطبوعہ ۱۸۳۷ء

۳۔ تحقیقات چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی ایڈیشن اول مطبوعہ ۱۸۶۷ء

۴۔ تاریخ محمد شاہی فارسی قلمی مصنفہ منشی خوشحالچند سال تصنیف ۱۱۴۲ھ

۵۔ خلاصۃ التواریخ فارسی قلمی مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی سال تصنیف ۱۱۰۷ھ عہد عالمگیر ٭

۶۔ تاریخ پنجاب اُردو خان بہادر جج محمد لطیف مطبوعہ ۱۸۸۹ء ٭

۷۔ تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال مطبوعہ ۱۸۸۴ء

۸۔ تاریخ ہند مصنفہ مولانا ذکاء اللہ جلد ششم و ہفتم و ہشتم مطبوعہ ۱۸۹۸ء

۹۔ مثنوی بے نظیر غیر مطبوعہ مصنفہ ظفر خان احسن شاہجہانی گورنر کشمیر ٭

۱۰۔ لاہور کے بعض اخبارات و رسائل ٭

دوسرے ٹکڑے کا نام عصر گذشتہ لاہور ہے۔ اس کا بہت سا حصہ لکھا جا چکا ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور موت نے مہلت دی اور حالات و واقعات نے اجازت دی تو اس میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی توقع اور گنجایش ہے ٭

لاہور عالم وجود میں آنے کے بعد جن حادثات و سوانحات سے گذرتا رہا ہے اور مغل حکومت کے زرین عہد میں جو عروج و اقتدار اس نے حاصل کیا ہے۔ اور زوال مغلیہ کے بعد اس عروس البلاد پر اور اس کی عالیشان فلک نما تعمیرات اور ارم تخمیر

باغات اعداس کے امن پسند باشندوں پر جو تباہی و بربادی قریباً ایک سو سال آتی رہی ہے اس کا دردناک ذکر ایک دفعہ تو دلوں کو ہلا و بیگا۔ اور فاعتبروا یا اولی الابصار کا عبرت آگین منظر پیش کریگا۔ غرض لاہور کے آثار قدیمہ کی یہ سرگذشت مرمٹوں کا نشان بتانے اور عبرت و بصیرت کا سبق دینے کے لیے خضر راہ کا کام دیگی۔

محمد الدین فوق لاہور

۱۳ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء[1] مطابق ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۱ھ موافق ۲۹ ہاڑ سنہ ۱۹۸۰ بکرمی یوم جمعۃ المبارک

---

[1] یہ کتاب بعض وجوہات سے جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کی بجائے مارچ سنہ ۱۹۲۵ء میں چھپی۔

شالامار باغ لاہور

تعمیرِ باغ کی مختلف روایتیں | اس مشہور و مقبول عام باغ کی تعمیر کے متعلق[1] مختلف روایتیں نظر سے گزری ہیں۔ جن میں سے دو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ شاہجہان نے ایک رات شاہدرہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک خواب دیکھا جس میں ایک باغ نظر آیا جو بہشت بریں کا نمونہ تھا۔ اس باغ میں سونے کے پھل، سنگ مرمر کے فوارے، زمرد کے درخت اور رنگین حوض تھے۔ شاہجہان نے بیدار ہو کر نواب علیمردان خان کو اپنا خواب سنایا۔ اور حکم دیا۔ کہ کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر میرے خواب کے مطابق ایک باغ تعمیر کیا جائے۔ نواب علیمردان خان نے بادشاہ کے ارشاد کے مطابق ایک ایسے باغ کی بنیاد رکھی جس میں بہشت کے سات طبقوں کی طرح سات تختے تجویز کئے۔ اور جن میں عالیشان محلات، و ایوانات تیار کرائے۔

دوسری[2] روایت یہ ہے۔ کہ بادشاہ لاہور میں تھا۔ علیمردان نے عرض کیا۔ فدوی کے ہمراہ ایک شخص ہے کہ وہ نہروں کے بنانے اور آبپاشی کے فن میں کمال رکھتا ہے۔ اور وہ عہد کرتا ہے کہ اس مقام سے جہاں آب راوی کوہستان سے نکل کر ہموار زمین پر بہتا ہے۔ ایک نہر نکال کر جوائے لاہور تک لائیگا جس سے کھیتوں اور باغوں میں آبپاشی ہوگی۔ بادشاہ نے منظور کیا اور نہر کی کھدائی اور باغ کے احداث کئے جانے کے احکام صادر ہو گئے۔ جن لوگوں کو شاہجہان کے شوقِ عمارات و باغات کا حال معلوم ہے وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ روایت اول محض سنی سنائی بات ہے۔ دوسری روایت البتہ

---

[1] از تحقیقاتِ چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی لاہوری مرحوم

[2] از ظفر نامہ شاہجہان یعنی تتمہ ششم تاریخ ہند مصنفہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم

وزن دار۔ پائدار۔ اور مستند اور صحیح معلوم ہوتی ہے ٭

شالامار کے مختلف نام

اس بے نظیر باغ کی تعمیری روایتوں کی طرح اس کے نام شالامار کی وجہ تسمیہ میں بھی کئی روایتیں مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس کا نام اصل میں شعلۂ ماہ یعنی چاند کا شعلہ تھا۔ بعض اس کو شالائے ماہ کہتے ہیں۔ شالا بزبانِ ہندی گھر کو کہتے ہیں۔ جیسے گئوشالا۔ پاٹ شالا۔ دھرم شالا۔ ماہ فارسی لفظ ہے بمعنی چاند۔ یعنی چاند کا گھر۔ بعضوں کے نزدیک "شالامار" نام درست ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ "شالا" گھر اور "مار" کشمیری میں ندی یا نالہ کو کہتے ہیں۔ یعنی ندی کا گھر۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ شالامار ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنے باغ کے ہیں ٭

رنجیت سنگھ کے دربار میں شالامار کی وجہ تسمیہ پر بحث

جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں شالامار کی وجہ تسمیہ پر سرگرم بحث ہوئی۔ مہاراجہ نے کہا۔ ضلع جھنگ کی زبان میں شالا کے معنی پرمیشر کے ہیں اور مار دیسی زبان میں بددعا یعنی لعنت کو کہتے ہیں۔ میں ایسا نام پسند نہیں کرتا۔ مناسب ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔ ایک درباری نے کہا حضور شالامار ترکی لفظ ہے جس کے معنی عشرت گاہ کے ہیں۔ مہاراجہ نے کہا۔ اگر چغتائی بادشاہوں نے ترکی نام رکھا ہے تو نادر شاہ کی تاریخوں میں اس کا نام شعلۂ ماہ کیوں رکھا گیا ہے؟ مہاراجہ نے خود ہی اس کا نام شالامار کی جگہ شہلا باغ تجویز کیا۔ اور کہا کہ شہلا کے معنے سیاہ چشم معشوق کے ہیں۔ اس لئے یہ نام اچھا ہے۔ اور حکم دیا۔ کہ خط وکتابت سرکاری میں آئندہ اس کا نام شہلا باغ لکھا جائے" ٭

لہ رائے بہادر پنڈت شیونرائن شمیم جو اپنے تاریخی مذاق کی وجہ سے علمی دنیا میں شہرت خاص رکھتے ہیں وہ جج محمد لطیف کے اس بیان کردہ واقعہ کے متعلق اپنے مضمون بعنوان "شالامار باغ لاہور" مندرجہ رسالہ ہمایوں لاہور جلد ۱ نمبر ۱ بابت ماہ جنوری ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ یہ قصہ قدرے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بحث اہل کاروں میں ہوئی ہوگی۔ مہاراجہ کو اس قدر باریکیوں سے کیا مطلب۔ ہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۰)

باغ کا اصل نام کیا تھا

نج محمد لطیف نے اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس باغ کا نام
شالا مار نادر شاہ کے مؤرخوں نے لکھا ہے۔ میرے خیال میں نادر شاہی مؤرخوں
کو شالا مار کے معانی و مطالب معلوم نہیں ہوئے ہونگے۔ انہوں نے یہی سمجھا ہوگا
کہ اس کا نام شعلہ ماہ ہوگا اور وہی بگڑ کر شالا مار بن گیا ہوگا۔ باغ کے مختلف
طبقوں کے نام ضرور فرح بخش اور فیض بخش ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔
مگر اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ نہ صرف باغ لاہور کا نام باغ کشمیر کی طرح شالا
مار باغ ہی تھا بلکہ باغ لاہور کے طبقوں کے نام بھی باغ کشمیر کے طبقوں کی طرح
فرح بخش اور فیض بخش وغیرہ تھے۔ چنانچہ خلاصۃ التواریخ میں جو عالمگیر کے چالیسویں
سال جلوس کی تصنیف ہے۔ شالا مار باغ لاہور کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ (صفحہ ۹۶
پر) درج ہے "اگرچہ در حواشی شہر فراواں باغ دلکشا و ہزاران گلشن فرحت افزا
اما باغ شالا مار کہ حضرت شاہجہان بادشاہ بتقلید باغ کشمیر احداث فرمودہ اند۔
دلفریب نظارگیاں است" یہ زمانہ یعنی عالمگیر کا چالیسواں سال جلوس نادر شاہی
حملہ ۱۷۳۹ء سے قریباً ۴۱-۴۲ سال پیشتر کا تھا اور مصنف خلاصۃ التواریخ ان
ایام میں بقید حیات تھا۔ نادر شاہی مورخوں نے شعلہ ماہ کا جو نام لکھا ہے وہ غلط
ہے۔ چونکہ کشمیر کے شاہی باغ کا نام شالا مار باغ تھا۔ اس لئے اسکی تقلید میں لاہور کے
باغ کا نام بھی شالا مار ہی مشہور ہوگیا۔ اور "شالا مار" کے نام کی تصدیق اس قطعہ تاریخ
سے بھی ہوتی ہے جو شاہجہان کے زمانہ ہی میں احداث باغ کے وقت ایک شاعر
نے پیش کیا تھا۔ اور جس نے اس بحث کا قطعی خاتمہ کر دیا ہے کہ باغ کا اصل نام
شعلہ ماہ ہے یا شالا ماہ یا شالا مار۔ وہ قطعہ جس سے سال ۱۰۵۱ھ برآمد ہوتا ہے

کہ لفظ شالا مار جس میں لفظ "مار" آتا تھا مہاراجہ کو پسند نہ آیا ہوگا۔ کسی درباری نے نام شہلا بنایا اور معنی بتلائے ہونگے جو مہاراجہ کو پسند آئے اور انہوں نے احکام جاری کر دیئے۔

؎ منشی سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی نے یہ کتاب عرصہ ہوا پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں قلمی دیکھی تھی۔ اب ۱۹۱۸ء میں مراد آباد میں چھپ چکی ہے۔

حسبِ ذیل ہے

چوں شاہِ جہاں پادشاہ جامئے دیں — آراستہ "شالامار" باطرزِ متیں
تاریخ بنائے ایں نہ ضواں جستم — گفتا کہ بگو نمونۂ خلدِ بریں

البتہ آجکل اس باغ کا نام عام طور پر شالامار باغ کی جگہ شہلا باغ زیادہ زبان زدِ عوام ہے۔ اور یہ غالباً اُس زمانہ سے ہے جب رنجیت سنگھ نے اس کا نام "شہلا باغ" سرکاری کاغذات میں رائج کرا دیا۔ اور یہ باغ ایک طور پر "شالامار باغ" کے طویل نام کا خلاصہ بھی ہے +

اُستاد جانی میر عمارت شالامار نواب علیمردان خان شاہجہان کا ایک اعلیٰ ملکی افسر ہی نہ تھا بلکہ وہ اعلیٰ انجینیئر بھی تھا۔ اس کے ماتحت ایک نہایت اچھا معمار اُستاد جانی نام تھا۔ نواب علیمردان خان نے اس کی قابلیت اور ذہانت کا ذکر بادشاہ سے کیا۔ بلکہ ...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نقشہ اس باغ کا بھی اُسی نے مرتب کیا تھا جو بادشاہ کو نہایت پسند آیا۔ اور اس صلہ میں اُستاد جانی کو شالامار کا میر عمارت مقرر فرمایا گیا +

اُستاد جانی کا جب انتقال ہوا۔ تو بادشاہ اس وقت اجمیر میں تھے۔ نہایت افسوس کیا اور حکم دیا کہ خزانۂ لاہور سے اس کا مقبرہ سرکاری خرچ پر تعمیر کیا جائے۔ یہ مقبرہ موضع باغبانپورہ وگورستانِ مہرسنگا کے درمیان تھا۔ نواب شہنواز خاں ناظم پنجاب کے زمانہ تک جس کو آج (۱۹۲۳ء میں) قریباً پونے دوسو سال گذر چکے ہیں۔ مقبرہ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا۔ لیکن حکومتِ مغلیہ کے زوال اور ناظمانِ لاہور کے خاتمہ کے بعد جب سکھوں کا عمل دخل پنجاب میں ہونے لگا۔ تو سنگِ مرمر کی خوشنما سلوں اور مختلف قسم کے بیش قیمت پتھروں کی وجہ سے اس مقبرہ کی بھی شامت آ گئی۔ اب رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ قبر کے تعویذ کا ایک بوسیدہ سا نشان موجود ہے۔ اور کسی خاص واقف کار کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں ہے کہ یہاں کس دل و دماغ کا ماہر تعمیرات دفن ہے +

---

[۱] تحقیقات چشتی ایڈیشن دوم صفحہ ۱۱۱ تاریخ لاہور رائے کنہیا لال صفحہ ۳۵۴

شالامار کا سب سے پہلا داروغہ شاہی

نواب علیمردان خان نے باغ کی تعمیر و آبادی کے لئے لاہور کے گرد و نواح میں زمین کی تلاش شروع کی۔ لاہور کے شرق رویہ باغبانپورہ (باغبانپورہ) اسحاق پورہ دو مواضعات تھے۔ بادشاہ کے حکم سے اسحاق پورہ کی جگہ باغ تعمیر ہونا شروع ہوا۔ میر مہنگا اس زمین کا مالک تھا۔ بادشاہ نے قیمت دینی چاہی۔ مگر میر مہنگا نے باوجود بادشاہ کے اصرار کے قیمت لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ اس شاہی باغ کی حفاظت و نگرانی نسلاً بعد نسلاً میر مہنگا کے سپرد ہوئی۔ اور میر مہنگا اس باغ کا سب سے پہلا شاہی داروغہ مقرر ہوا +

شاہ نہر اور آبپاشی کے چاہات

باغ کی چار دیواری کے باہر جنوبی گوشہ میں ایک عظیم الشان پختہ اور فراخ کنواں جس کو بارہ ہرا[1] چاہ کہتے ہیں کھدوایا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چاہات تیار ہوئے۔ مگر اصل چیز جو اس وسیع و عالیشان اور بےنظیر باغ کی جان ہے۔ وہ نہر مادھوپور ہے۔ جس کو دریائے راوی سے نکالنے اور شالامار باغ تک لانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی لاگت آئی تھی۔ چنانچہ منشی خوشحال چند سامی[2] اپنی تاریخ محمد شاہی میں صفحہ ۱۳۸ پر "احداث شاہ نہر لاہور باہتمام علی مردان خان" کے ذکر میں لکھتے ہیں* "مبلغ یک لک روپیہ حوالہ علی مردان شد کہ از دریائے راوی نہرے کہ آب بہ بساتین دارالسلطنت خاطر خواہ رسد۔ جدا کردہ بیارد۔ چنانچہ از موضع راجپور کہ از انجا تا دارالسلطنت مسافت چہل و ہشت و نیم کروہ جریبی بود شروع نمودہ باتمام رسانید" لیکن پانی بہت تھوڑی مقدار میں آتا تھا۔ اس لئے ملا علاء الملک کو کہ فن

---

[1] سرکار انگریزی نے اس چاہ کو جو مرور ایام کی وجہ سے بالکل ویران ہو گیا تھا۔ از سر نو مرمت کرا کر اس میں ایک انجن لگایا ہے جو اس سے پانی کھینچ کر بالائی تالابوں میں لے جاتا ہے اور وہاں سے باغ کے فواروں کو سیراب کرتا ہے [2] مادھوپور ضلع گورداسپور میں سجان پور سے چار پانچ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ جس نے یہ نہر سجان پور میں دیکھی ہے۔ پانی اس کا اس مقام پر نہایت سُر تھا۔ [3] منشی خوشحالچند سامی نے عالمگیر۔ بہادرشاہ۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ تاریخ محمد شاہی میں علاوہ دیگر مفصل حالات کے محمد شاہ کی دس سالہ حکومت (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۴۱ھ) کا ذکر ہے۔ یہ تاریخ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اور میری نظر سے گذر چکی ہے +

آب ترازو میں صاحبِ کمال تھا۔ ایک لاکھ روپیہ اس غرض سے ملا کہ چشمۂ خیر ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے منبع نہر کو کشادہ تر کیا جائے۔ پادشاہنامہ میں لکھا ہے اور تاریخ محمد شاہی نے بھی (صفحہ ۱۳۸ پر) اس کی تائید کی ہے۔ کہ کارپردازوں نے بیوقوفی اور عدم مہارت سے اس روپیہ میں سے پچاس ہزار روپے نہر سابق کی مرمت میں صرف کر دیئے۔ آخر کار تیس کوس[1] نہر کھودی گئی۔ جس سے پانی بافراط آنے لگا۔ مصنف تاریخ محمد شاہی نے بھی لکھا ہے:۔ "آب وافر را آورد۔ چنانچہ تا حال آب وافر بے فتور بہ باغات میرسد"۔ یہ نہر جس کا نام شاہ نہر ہے۔ اب تک جاری ہے اور صدہا مواضعات کو سیراب کر رہی ہے اس نہر کی اُس شاخ کا نام جو امرتسر سے لاہور اور پھر شالا باغ تک آتی ہے راجباہ شالا باغ ہے +

شالا باغ کی لاگت و سالِ تعمیر | شاہ نہر کے دو لاکھ روپیہ کے علاوہ شالا باغ کی تعمیر پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ یعنی نہر اور باغ آٹھ لاکھ روپے میں تیار ہو گئے۔ آجکل جبکہ معمار کی یومیہ اُجرت اڑھائی تین روپے اور مزدور کی مزدوری ایک روپیہ سے سوا روپیہ تک روزانہ ہے۔ یہ لاگت شاید بہت کم معلوم ہو۔ لیکن ذرا وہ زمانہ ذہن میں لایئے جب مزدور چار یا پانچ پیسے روز اور معمار دو تین آنہ یومیہ کماتا تھا۔ اور غلہ گندم چار یا پانچ آنہ کو ایک من میسر ہو جاتا تھا۔ پھر آپ کو ۸ لاکھ کی قدر و قیمت معلوم ہو سکتی ہے +

مدتِ تعمیر اور سالِ تعمیر کے متعلق تاریخ لاہور انگریزی ظفرنامہ شاہجہان، تاریخ لاہور اُردو اور تحقیقاتِ چشتی میں لکھا ہے۔ کہ ایک سال چار ماہ پانچ یوم کی مدت میں یہ باغ تعمیر ہو گیا۔ لیکن تعجب ہے کہ باغ جس کی ابتدائی تعمیر ۱۰۴۷ھ سے شروع ہوتی ہے۔ اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سال چند ماہ میں تیار ہو گیا۔ اس کی تیاری و تکمیل کی اطلاع ۱۰۵۲ھ میں بادشاہ کو ملتی ہے۔ چنانچہ ظفرنامہ شاہجہان میں شانزدہم سال جلوس کے واقعات ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء میں لکھا ہے:۔ "بادشاہ سے عرض کیا گیا۔ کہ شالا مار باغ تیار ہو گیا ہے"۔ شاہجہان ۱۰۴۸ھ اور ۱۰۴۹ھ اور اپنے چودھویں

[1] بقول تاریخ محمد شاہی ۳۲ کوس +

سال جلوس سنہ ۱۰۵۰ھ میں بھی لاہور میں آیا ہے لیکن ان سالوں میں کبھی اسے شالا باغ کی تکمیل کی اطلاع نہ دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنہ ۱۰۵۰ھ کے بعد باغ کی کُل عمارتیں اور نہر اور طبقے تیار ہوئے ہیں۔ اور جب سنہ ۱۰۵۱ھ میں شاہجہان لاہور آیا ہے۔ تو اسے ملاحظہ و معائنہ کے لئے عرض کیا گیا ہے۔ یا اگر یہ صحیح سمجھا جائے۔ کہ ایک سال چار ماہ پانچ یوم ہی میں باغ تیار ہوا ہے۔ تو پھر سنہ تعمیر سنہ ۱۰۴۷ھ نہیں بلکہ سنہ ۱۰۵۱ھ تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن شالامار کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ

چوں شاہجہاں پادشاہ حامئے دیں آراستہ شالامار باطرز متیں
تاریخ بنائے ایں ز رضواں جستم گفتا کہ بگو نمونۂ خلد بریں
۱۰۴۷

اس تسلیم" کی تکذیب کرتا ہے۔ بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نمونہ خلد بریں اس کو اس وقت کہا گیا ہے جب وہ باطرز متیں آراستہ ہو گیا تھا۔ یا بالفاظِ دیگر سنہ ۱۰۴۷ھ باغ کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ لیکن تمام مورخوں نے اس قطعۂ تاریخ کو چونکہ احداث باغ کا ابتدائی سال ظاہر کیا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ جب شاہجہان نے کشمیر کے نمونے پر لاہور میں بھی شالا باغ کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ تو شاعر نے اُسی وقت یہ برجستہ قطعہ موزون کر دیا ہو۔ لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور شاعر کو دس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ عطا کیا۔

نیز یہ قطعہ و نمونۂ خلد بریں سنہ ۱۰۴۷ھ) اس لئے بھی اختتام سال کی تاریخ نہیں ہو سکتا۔ کہ تاریخ محمد شاہی میں احداث نہر اور شالامار باغ کی آبپاشی کے ذریعہ کا ذکر سنہ ۱۰۴۹ھ کے واقعات میں کیا گیا ہے۔ گویا اُس وقت تک باغ نامکمل تھا۔ اور شہنشاہ کے ملاحظہ کے قابل نہ تھا۔

شاہجہان کا داخلہ شالا باغ میں

آخر وہ وقت آیا۔ کہ جب باغ کی چار دیواری مکمل ہو گئی۔ باغ کی آبشاریں۔ تالاب۔ فوارے۔ عمارات اور مختلف طبقے اور ان طبقوں کی عمارتیں اور شاہ نہر تیار ہو گئی۔ بلکہ چار، پانچ سال کے عرصہ میں باغ کے گل و شجر بھی اپنی بہار دکھانے لگے تو نواب علی مردان خان نے شہنشاہ کی خدمت میں باغ کی

تیاری و تکمیل کی گذارش کی اور اس کے ملاحظہ و معائنہ کے لئے عرض کیا۔ شہنشاہ نے شاہی منجموں کو ساعتِ سعید دیکھنے کا حکم دیا۔ ان سب نے متفق ہو کر ایک تاریخ مقرر کی۔ اور شہنشاہ معہ اعیانِ سلطنت ۷ رشعبان المعظم ۱۰۵۲ھ کو اس باغ میں جس کو شاعر نے بجا طور پر نمونہ خلد بریں کہا ہے داخل ہوا۔

شاہجہان باغ اور اُس کی پُر تکلف عمارات۔ حمام۔ آبشار۔ بڑے تالاب اور تختِ سنگِ مرمر اور باغ کے مختلف طبقوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ وزراء اور امراء دربار نے مبارک باد دی۔ اور سب نے مل کر شہنشاہ کے قیام سلطنت اور اسکی درازئے عمر اور جاہ و جلال کی دعا کی۔ بادشاہ کے حضور میں اس وقت ہندوستان اور ممالکِ غیر کے منتخب حکیم و دانا علماء و فضلاء و سیاحانِ عالم اور برگزیدہ اہلِ دماغ تھے۔ جو روم۔ عراق اور ماوراء النہر تک کی بہاریں دیکھ آئے تھے۔ سب نے عرض کیا۔ ایسا باغ کہیں تعمیر ہوا ہے نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ سُنا ہے۔ اسی باغ میں ۱۸ رشعبان کو شہنشاہ نے سعید خان کو خلعتِ خاصہ اور صوبیداری لاہور کا اعزاز بخشا۔ ۲ ر رمضان کو بادشاہ اکبرآباد روانہ ہو گیا۔

باغ کے متعلقہ مکانات ملا عبد الحمید لاہوری جو شاہجہان کے زمانہ کا ایک نامور مصنف گذرا ہے بادشاہنامہ میں لکھتا ہے۔ اس باغ کے ساتھ اس قدر مکانات بنائے گئے تھے کہ جب کبھی شہنشاہ لاہور آتا تھا۔ اور اس کے حرم محترم اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ تو شہنشاہ کو بیگمات کے لئے خیمہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ امراء۔ وزراء مہتابی باغ اور گلابی باغ وغیرہ کے مکانات میں کہ وہ بھی عالیشان اور خوشنما تھے ٹھیرا کرتے تھے۔

شالامار کے سات تختے شالامار درحقیقت سات باغوں کا ایک باغ تھا جن کے نام بھی مختلف تھے۔ اب وہ باغ جس کا نام شالامار ہے تین تختوں پر منقسم ہے۔ ہر تختہ کا نام الگ الگ ہے۔ اب عام لوگ انہی تینوں تختوں یا طبقوں کو شالامار سمجھتے اور کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ چار باغ بھی تھے۔ جن میں سے تین تو اس وقت کسی نہ کسی حالت میں

موجود ہیں ایک کا پتہ نہیں چلتا +

انگوری باغ | شالامار کے ہر باغ کا حال الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ باغ شالا
مار کے جنوب کی طرف واقع ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مالِ مفت دلِ بے رحم کی
مشہور ضرب المثل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ بادشاہی باغ پنڈت برج ناتھ
ایک برہمن کو سنکلپ کر دیا تھا۔ جو آج تک اُس کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ اس
باغ میں صرف انگور کی بیلیں تھیں اور اپنی سرسبزی و شادابی سے دلوں کو ناقابل
بیان فرحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی طراوت دیتی تھیں +

عنایت باغ | اس کو باغِ عنایت آباد بھی کہتے ہیں۔ یہ انگوری باغ اور شالامار
کے درمیان واقع ہے۔ یہ باغ جس کی چار دیواری شاہجہانی عہد کی اب تک موجود ہے
مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں سردار بخشیش سنگھ سندھانوالیہ کو عنایت ہوا
تھا۔ اب بھی سرداران سندھانوالیہ اس پر قابض ہیں۔ شالامار کے بڑے دروازے
کے سامنے یہ باغ موجود ہے۔ نہر جو شالامار کو سیراب کرتی ہے اسی باغ سے ہو کر
آتی ہے۔ شالامار کے بڑے دروازہ اور عنایت باغ کے درمیان صرف امرتسر
کی جرنیلی سڑک ہے۔ اس باغ میں جو عمارات لبِ سڑک واقعہ ہیں جہاں دو دکاندار
بھی بیٹھتے ہیں اور جن سے چند قدم آگے پولیس کی چوکی اور چھپر خانہ اور ایک کنواں
ہے۔ ان پر سرکار انگریزی کا قبضہ ہے۔ باغ میں آموں کے درخت بکثرت ہیں۔
زراعت بھی اس میں کافی ہوتی ہے۔ نہر کے دونوں طرف باغ کے اندر ایک مقام
پر پختہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ اب وہ مسمار ہو چکے ہیں۔ اور ان کے نشانات موجود
ہیں۔ یہ مکان غالباً سکھوں کے زمانے میں بنائے گئے تھے۔ جب یہ باغ اپنے پورے
شباب پر تھا۔ تو یہ شعر اس کے بالکل حسبِ حال تھا ؎

چہ گویم وصفِ گلزارِ عنایت | کہ از وصفش نہ حد است و نہ غایت

مہتابی باغ | یہ باغ موجودہ شالامار کے تیسرے تختہ فرح بخش سے ذرا آگے شمال کی
طرف تھا۔ اور شالامار کا چھوٹا باغ کہلاتا تھا۔ اب بالکل ویران پڑا ہے۔ دیواریں بھی

نظر نہیں آتیں۔ البتہ سرکار انگریزی کے ابتدائی عہد تک خستہ و شکستہ حالت میں موجود تھیں۔ سرکار نے سنہ ۱۸۶۹ء میں وہ دیواریں رائے میلا رام[1] ٹھیکہ دار کے پاس فروخت کر دیں۔ اور اُس نے ایسی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ کہ وہاں کوئی اینٹ تک بھی نہ رہنے دی ✦

دوسرے تختے میں جس کا نام حیات بخش ہے دو کلان دروازے ہیں جن میں سے ہاتھی معہ ہودہ بفراغت تمام گذر سکتا ہے۔ ان دروازوں پر کاشی کا پُر تکلف کام ہے۔ ان میں سے شرقی بند ہے اور غربی کھلا ہوا ہے۔ اس باغ یعنی حیات بخش کے شمال کیطرف میانہ میں ایک بارہ دری ہے جس کی شرقی و غربی بغلوں میں ایک ایک در تھا۔ انہی دروں میں سے مہتابی باغ شالامار کے ساتھ ملحق تھا۔ یہ دروازہ جو شاہی زمانہ کا تھا۔ اب بالکل بند ہے ✦

رنجیت سنگھ نے بھی اپنے عہد میں شالامار سے مہتابی باغ کو جانے کے لئے دو رستے نکلوائے تھے۔ ایک مشرق کی طرف دوسرا مغرب کی جانب چھوٹا سا دروازہ جو اب بھی بارہ ہزاما چاہ کی طرف موجود ہے ✦

جہاں مہتابی باغ تھا وہاں آم کے درخت منتشر طور پر اب بھی موجود ہیں باغ کی ویران زمین پر اب زراعت ہوتی ہے ✦

گلابی باغ یہ باغ جو درحقیقت شالامار کا ساتواں یا آخری باغ کہلاتا ہے شالامار سے مغرب کی طرف واقعہ تھا۔ اس باغ میں صرف پھل پھول اور گل و گلزار ہر موسم میں بوئے جاتے تھے واقعی اسم بامسمیٰ باغ تھا۔ افسوس اب اس کا کہیں نام بھی نہیں ہے ✦

شالامار باغ شالامار کے چار باغات کا جو ہر چند طبقوں اور تختوں کی شکل میں نہیں تھے بیان ہو چکا ہے۔ اب صرف اُن تین باغوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کا نام شالامار باغ مشہور ہے اور جو تین تختوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے پہلے تختہ

[1] لاہور کے مشہور رئیس آنریبل رائے بہادر لالہ رام سرن داس سی۔ آئی۔ ای آپ ہی کے صاحبزادہ تھے

کا نام فیض بخش ہے ؛

نگار خانہ یا نگاہ خانہ | شالامار کے مشرق کی طرف ایک مقام نگاہ خانہ کے نام سے مشہور ہے ۔ جس کو عام لوگ نگار خانہ کہتے ہیں ۔ اس کے شمال و جنوب میں دو بڑے دروازے ہیں ۔ اور گرد و نواح میں چار دیواری خشتی ہے ۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ غربی بارہ دری میں بیٹھ کر فوج کا ملاحظہ کرتا تھا ۔ فوج ایک دروازہ سے آتی اور دوسرے سے نکل جاتی تھی ۔ اسی وجہ سے اس مقام کا نام نگاہ خانہ رکھا گیا ۔ مگر غلط العام نگار خانہ مشہور ہو گیا ۔ وہ بارہ دری جس میں بادشاہ جلوس فرما ہوتا تھا سکھوں کے آخر عہد میں مسمار ہو گئی تھی ۔ سر ہنری کرنل لارنس نے اپنے زمانہ ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء میں اس کی تعمیر کرا دی تھی ؛

خوابگاہ یا باغ کا بڑا دروازہ | تحقیقات چشتی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ باغ کا اصل دروازہ جو شاہی زمانہ میں تھا اصطبل کی شمالی و غربی جانب تھا وہ دروازہ اب گرا دیا گیا ہے ۔ موجودہ دروازہ جس کے اندر سے باغ میں داخل ہوتے ہیں اور جامرتسر جانے والی سڑک کے کنارہ پر واقع ہے ۔ بعد میں بنایا گیا ہے ۔ یہاں ایک خوابگاہ تھی اور اسی خوابگاہ کی دیوار کو پھاڑ کر موجودہ کلاں دروازہ آمد و رفت کے لئے جاری کیا گیا ہے ۔ لکھا ہے ۔ کہ یہ خوابگاہ تمام و کمال سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی ۔ یہ خوابگاہ باغ کے پہلے درجہ پر تھی ؛

تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ خان بہادر جج محمد لطیف میں لکھا ہے ۔ اس کے اندر سنگ مرمر کی ایک عمارت تھی ۔ حاکمانِ لاہور نے اس کا پتھر اور فواروں کا تانبا جو کئی من وزنی تھا کمینوں کے پاس فروخت کر دیا ۔ اور عمارت کو بالکل برباد کر دیا ؛

دروازہ کلاں کے اندر داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی کے اندر عین وسط میں ایک فوارہ ہے اور اس کے سامنے ہی فواروں کی لمبی قطار بڑی بارہ دری تک چلی جاتی ہے ۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل دروازہ نہیں ہے ۔ اس لئے کہ اصل دروازہ باغ کی شان اور حیثیت کے مطابق بہت کھلا ہونا چاہیے تھا ۔ اور اس میں داخل ہوتے اور پیر معبول

ادب ۔ ایڈیشن دوم صفحہ ۱۳۲ ؛

سے اُترنے ہی فواروں کی ضرورت نہ تھی *

خواص پورہ | خواب گاہ کے متصل خواص پورہ کے نام سے ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ جہاں شاہی بیگمات تفریح کے لئے جاتی تھیں۔ سکھوں کے زمانہ میں اسکی بنیادیں تک بھی کھود دی گئیں۔ اور بعدہ انگریزی کرنل نسبٹ ڈپٹی کمشنر کے زمانہ میں اس کا ملبہ بھی فروخت کر دیا گیا۔ یہی کرنل نسبٹ بعد میں کمشنر راولپنڈی اور پھر ریذیڈنٹ کشمیر ہو گئے تھے *

پہلا تختہ یا باغ فیض بخش | شالا باغ کے اس تختہ کی ڈیوڑھی ہی باغ کا دروازہ کلاں ہے ڈیوڑھی کی پیشانی بالکل سادہ ہے۔ چند سیڑھیوں کے بعد عین وسط صحن میں ایک فوارہ ہے جو ٹوٹا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی میں اور مسقف برانڈہ کی دیواروں پر سنگ مرمر کا بکثرت استعمال ہے۔ اس باغ کی جنوبی جانب میجر میاک گریگر ڈپٹی کمشنر لاہور نے بارہ دری کے اندر سے ایک جدید دروازہ اپنے عہد میں نکالا تھا۔ جو اب تک قائم و جاری ہے۔ ڈیوڑھی کے مسقف برانڈہ کے پاس ہی سے فوارے شروع ہو جاتے ہیں۔ جن کے دونوں طرف ۱۲-۱۲ فٹ چوڑا پختہ فرش ہے۔ بیس فواروں کے بعد ایک وسیع حوض آتا ہے۔ جس کے چاروں طرف فوارے اور نہریں رواں ہیں۔ اور ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے سنگ سُرخ کا فرش آتا ہے۔ حوض میں بھی بلند ہی فوارے ہیں۔ شرقی اور غربی جانب بیس بیس فواروں کے بعد ایک ایک بارہ دری آتی ہے۔ اور ڈیوڑھی کے بالمقابل وہ بارہ دری کلاں ہے جس کے نیچے دوسرا تختہ یعنی باغ حیات بخش واقعہ ہے۔ باغ فیض بخش کے چاروں گوشوں پر بُرجیاں ہیں۔ جن کے آٹھ آٹھ محرابی در ہیں *

راقم الحروف نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۵ء کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب درختوں کی گنجانی کی وجہ سے مہلہ کے ایام میں تماشائیوں کو خیمے لگانے دشوار ہو جاتے تھے اب یہ حال ہے۔ کہ دور دور تک سبزہ کا قدرتی فرش مخمل کے بچھونے کا لطف دے رہا ہے۔ درخت اب بھی اس تختہ پر بکثرت ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں سے بہت سے

چھانٹ دیئے گئے ہیں ۔

شاہی حمام شالامار کے تختہ اوّل کی بارہ دری کلاں کے متصل شرقی گوشہ میں مینار دبرجی ۲ کے نیچے ایک کمرہ تین دروازوں والا آتا ہے ۔ جس کی کنجی سرکاری ملازموں کے پاس رہتی ہے ۔ یہ رستہ شاہی حمام کو جاتا ہے ۔ اس کمرہ کے آگے چند سیڑھیاں نیچے کرنے کے بعد اور کئی مختلف قسم کے چھوٹے بڑے سات آٹھ کمرے آتے ہیں ۔ جن کے دروازوں پر کشمیری صنعت کے نقش ونگار اور گل بوٹے اب تک اپنی بہار دکھا رہے ہیں ۔ اندرونی دیواریں منقش ہیں ۔ ایک جگہ ایک کنواں بھی ہے جو اب بند کر دیا گیا ہے ۔ اس حمام کے تین درجے ہیں ۔ پہلے اور دوسرے درجہ میں دو فوارے ۔ تیسرے درجہ میں ایک حوض بغسل خانہ ۔ جن کی شرقی و غربی جانب دو دو آب ریز ۔ ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ذخیرہ یعنی سرد حوض اور دوسری طرف آب گرم کا حوض مقام آتش دان باغ کے باہر مشرق کی طرف ہے ۔ اس حمام کو ایک راستہ دوسرے تختہ یعنی باغ حیات بخش سے بھی جاتا ہے ۔ جو پہلے تختہ سے تیرہ چودہ فٹ نشیب میں ہے ۔ مگر اس راستہ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے ۔

اس تختہ میں دو کنوئیں بھی ہیں ۔ ایک تو ڈیوڑھی کلاں کے پاس ہی ہے جو چھوٹا ہے ۔ اور چاہ کلاں بارہ دری کلاں کے رستے میں آتا ہے ۔

میلہ کے دنوں میں یہاں خلقت کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے اور دو کانیں اس کثرت سے لگتی ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی ۔

سنگ یشب کا بیش قیمت حوض محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ تک اس باغ کی حفاظت و خبر گیری ناظمان لاہور کچھ نہ کچھ کرتے رہے ۔ مگر سلطنت کو ضعف آنے پر جب مسلمان اپنی حفاظت کرنے کے بھی ناقابل ہو گئے ۔ اور پنجاب میں لٹیروں نے غلبہ پانا شروع کر دیا ۔ تو لاہور اور اس کے مفصلات کے لاکھوں انسانوں کی قسمتیں ان تین نااہلوں ۱ نے آپس میں بانٹ لیں ۔ جو اخلاق و عمل ۔ تمدن و تہذیب بلکہ

۱ لہنا سنگھ ۔ سوبھا سنگھ ۔ گوجر سنگھ تینوں حاکموں کو سہ حاکمان لاہور ۔ اور راوی اٹک کو احدا محاکم کہتے تھے ۔

علم و عقل سے بھی کورے تھے۔ جو انسان کے ساتھ انسان کے لحاظ سے نہیں بلکہ مذہب کے اعتبار سے سلوک کرتے تھے۔ اور بعض اوقات وہ لوٹ گھسوٹ اور مار دھاڑ اور متمول لوگوں سے زبردستی روپیہ حاصل کرنے کے طمع میں مذہب کی پاسداری کو بھی خیر باد کہہ دیتے تھے۔ ان میں سے ایک حاکم کا نام لہنا سنگھ تھا۔ جو دہلی دروازے اور شہر کے تمام مشرقی حصے کا جس میں درس میاں وڈا اور شالا مار بھی شامل تھے مالک و حاکم تھا۔ جب سکھوں نے شالا مار باغ پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ تو حافظ علیم اللہ داروغہ نے جو مہر مہنگا شالا مار کے سب سے اول شاہی داروغہ کی اولاد سے تھا۔ سنگِ یشب کے ایک حوض پر جس کی قیمت کا اندازہ لاکھ روپیہ کے قریب بیان کیا جاتا ہے اس خوف سے بیلوں کی ایک آخر (کھرلی) بنالی کہ کہیں یہ ناخدا ترس اس کو بھی تباہ نہ کر دیں۔ سعید نام ایک شقی القلب مہر مہنگا سے عداوت رکھتا تھا۔ اس نے لہنا سنگھ اعدالحاکم کے پاس اس قیمتی حوض کی مخبری کر دی۔ لہنا سنگھ نے خبر ملتے ہی اس حوض کا سراغ نکالا اور اس کو کھدوا کر حکاکوں کے پاس پچیس ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا۔

بارہ دری کلاں یہ بارہ دری جو آبشار کلاں کے سر پر سایہ کئے ہوئے فیض بخش کی زینت کو دوبالا کر رہی ہے۔ اس کو محل میانہ بھی کہتے ہیں۔ اس بارہ دری کی عظمت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سنگِ مرمر کی سلوں کا فرش۔ سنگِ مرمر کی جالیاں جو منڈیروں پر لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے نقش و نگار۔ تالاب۔ حوض آبشار اور فواروں کے نظارے ناظر کا دل کھینچنے کے لئے کافی سے زیادہ اثر رکھتے تھے۔ ”حاکمانِ لاہور کا دور ختم ہونے کے بعد رنجیت سنگھ نے جو سلوک اس بےنظیر باغ کے پہلے تختہ کے ساتھ کیا۔ اس کی تھوڑی سی کیفیت ذیل کی سطور سے معلوم ہو سکیگی:۔ رنجیت سنگھ نے بارہ دری کلاں سے جو بالائے آبشار ہے سنگِ مرمر

[1] تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لعل ایگزیکٹو انجینئر لاہور ڈویژن صفحہ ۳۵۵ مطبوعہ سنہ ۱۸۸۴ء

کی سلیں اور پتھر معہ جالیوں کے اُتروا کر دربار امرت سر بھجوا دیا۔ بعد میں سفیدی سے درستی کرا دی گئی۔

اب بھی بارہ دری میں ہر اتوار کو بڑی رونق رہتی ہے۔ لوگ اپنے دوست و احباب کو جو پارٹیاں اور دعوتیں دیتے ہیں۔ وہ اسی بارہ دری میں ہوتی ہیں

ہمارے مٹنے میں بھی ہے نمود کی اک شان
مٹے بھی ہم تو مٹے ہیں گیاہ کی صورت
مؤلف

بارہ دری کی چار دیواری چار چار فٹ تک سنگِ مرمر سے مزین ہے۔ چھت نہایت نفیس خوبصورت اور خوشنما ہے۔ خوشنما بیل بوٹے۔ کئی طرح کے نقش و نگار خوبصورت شیشوں کی دلآویزی۔ یہ سب باتیں نہ صرف پرانے صناعوں کی یاد دلا رہی ہیں۔ بلکہ اس اُجڑی ہوئی حالت میں بھی باغ کی رونق اور سیاح کی تفریح طبع کا باعث ہیں۔ یہی وہ دلکش مقام ہے۔ جہاں بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ وزراء۔ اُمراء اور رؤسا سے لے کر غریب غرباء تک دوسرے تختہ کی تمام کیفیت ملاحظہ کرتے چلے آئے ہیں۔

سرد خانہ | گذشتہ زمانہ میں بجلی کے پنکھے نہیں تھے اور نہ برف کے کارخانے اس کثرت سے جاری تھے۔ اس لئے گرمی میں سردی کا لطف اُٹھانے کے لئے بادشاہوں کے محلات اور امراء کے مکانات کے نیچے سرد خانے یا بھورے بنائے جاتے تھے۔ اس قسم کے بھورے آج بھی بڑے بڑے شہروں خصوصاً لاہور کے ہر پرانے مکان کے نیچے موجود ہیں۔ اُمراء گرمی کے دنوں میں ان سرد خانوں میں جا کر لطف اُٹھاتے تھے۔ اسی قسم کا سرد خانہ بارہ دری کلاں کے جنوب میں دس بارہ قدم کے فاصلہ پر واقع ہے جس کی ایک دیوار بہت بڑے کنوئیں سے ملحق ہے۔ بائیس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک محرابی چھت کے نیچے نشست گاہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں سے پانی دو اڑھائی گز کے فاصلہ پر ہے۔ بادشاہوں نے تو جو لطف اُٹھانا تھا اُٹھا چکے اب تو یہاں عام لوگ بھی نہیں آتے نہ موجودہ زمانہ کے ساز و سامان نے اب اِن کی

ضرورت ہی رہنے دی ہے۔ البتہ سیاح لوگ آتے ہیں۔ اور سردخانہ کی سیر سے لطف
اندوز ہوتے ہیں ٭

شاہجہان کا جشن نوروز شالا باغ میں

شاہجہان جب کبھی شالمار کی تعمیر و تکمیل کے بعد
لاہور آیا ہے۔ تو اس نے باغ ہی میں جو اس نے بڑے شوق سے بنوایا تھا اقامت
کی ہے۔ غرہ ربیع الثانی ۱۰۶۱ھ کو جب وہ سفر کشمیر کے لئے لاہور پہنچا تو اسی باغ
میں اُترا۔ اور تختہ فیض بخش میں اس نے جشن نوروز کیا۔ جس میں ایک عظیم الشان
دربار ہوا۔ نذریں پیش ہوئیں اور خلعت و منصب اور انعام و اکرام سے مستحقین
سرافراز کئے گئے۔ ۲۰ رجادی الثانی سنہ ۱۰۶۱ھ کو بادشاہ یہاں سے کشمیر روانہ ہوا۔

دوسرا تختہ یعنی باغ حیات بخش

شالامار کا یہ تختہ خوبصورتی۔ خوشنمائی۔ رونق و زینت اور
نظاروں کی دلفریبی میں تمام درجوں سے بہتر و افضل بلکہ تمام باغ کی جان ہے۔ اس تختہ
کو بارہ دری کلاں کی دونوں جانب سے رستے ہیں۔ چند سیڑھیوں کے بعد جس میں پانچ
پانچ چھ چھ آدمی ایک ساتھ اُتر سکتے ہیں۔ اور جن میں میلہ کے ایام میں کھوے سے
کھوا چھلتا ہے اس تختہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس باغ کے شرقی و غربی
حصص نشیب میں ہیں۔ غربی حصہ کی دیوار کے عقب میں مہتابی باغ اپنی اُجڑی
ہوئی حالت میں نظر آتا ہے۔ شرقی دیوار کے ایک پہلو میں شاہی حمام کو رستہ
جاتا ہے جس کا ذکر طبقہ اول میں کیا جا چکا ہے ٭

آبشار کلاں اور سنگ مرمر کا تخت

اس بارہ دری کے نیچے آبشار جاری ہے۔
جس کی کھدائی کی تمام سیاح اور صناع بے حد تعریف کرتے ہیں۔ آبشار کی چادر
پر سے پانی لہریں بن کے آتا ہے اور تخت کے نیچے سے ہو کر بڑے تالاب میں چلا
جاتا ہے۔ آبشار اور تخت کے درمیان ایک فوارہ ہے جو گرمیوں میں عجیب لطف
دیتا ہے۔ آبشار اور تخت دونوں سنگ مرمر کے ہیں۔ تخت کے گرد ایک کٹہرا
بنا ہے وہ بھی سنگ مرمر ہی کا ہے۔ شاہجہان بنفس نفیس یہاں بیٹھتا اور گرد و
پیش کے نظاروں۔ فواروں۔ حوضوں۔ تالابوں اور آبشار سے پانی کے گرنے کی

کیفیت دیکھ کر باغ باغ ہوتا تھا۔ اور اپنا یہ طبعزاد شعر پڑھتا تھا ؎

شکر صد شکر مثلِ فوارہ ۔۔۔ وقفِ عام است ایں خزانۂ ما

سنگِ مرمر کا یہ بادشاہی تخت سیاح کو ٹوٹا ہوا نظر آئے گا۔ تخت کے اس ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ رنجیت سنگھ نے جب لاہور اور مضافات لاہور کے رؤساء اور ذمہ دار لوگوں کو اطمینان دلایا۔ کہ اگر تم میرے قبضۂ لاہور میں مزاحم نہ ہو۔ تو میں تم کو نہ صرف سہ حاکمانِ لاہور کے ظلم و ستم سے نجات دلاؤں گا بلکہ تمہارے مذہبی مکانات اور شاہی عمارات کو بھی گزند نہ پہنچاؤں گا۔ تو انہوں نے رنجیت سنگھ کو ہر قسم کی مدد دی۔ بلکہ دروازے تک کھول دیئے۔ رنجیت سنگھ نے قابض ہو کر اور اپنے پاؤں مضبوط جما کر وعدے کو بالائے طاق رکھا۔ اور اسلامی عمارتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج لاہور کے کسی اسلامی مقبرہ اور کسی اسلامی عمارت پر سنگِ مرمر، سنگِ یشب، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ نظر نہیں آتا۔ اگر سکھوں کی حکومت دس بیس سال اور رہ جاتی۔ تو شاید اسلامی عبادت گاہوں اور اسلامی مقبروں کا وجود بھی نہ رہتا۔ اور اگر رہتا۔ تو وہاں یا اصطبل ہوتے یا گولہ بارود۔ یا سکھ حکام کی رہائش۔ نہ مسجد مسجد رہتی نہ مقبرہ مقبرہ۔ غنیمت ہے۔ کہ بہت جلد الحاق پنجاب نے نہ صرف مسلمانوں کے زخمی دلوں کی بلکہ ان کی آفت رسیدہ عمارتوں کی بھی کچھ مرہم پٹی کر دی ؎

یہ کس نے پاؤں رکھا سرِ گورِ غریباں پر ۔۔۔ زمیں سے پھر ابھر آیا مزارِ بے نشاں میرا

تختِ سنگِ مرمر سے رنجیت سنگھ کا سلوک غرض رنجیت سنگھ نے اور اسلامی عمارتوں کو تباہ کرنے کے ساتھ شالامار پر بھی توجہ شروع کی۔ سکھ سہ حاکمانِ لاہور بہت کچھ یہاں سے لے گئے تھے۔ پھر بھی تختِ شاہی اور بارہ دریوں کے فرشِ سنگِ مرمر کے ابھی باقی تھے۔ رنجیت سنگھ نے حکم دیا۔ کہ تخت یہاں سے اکھاڑ کر دربار صاحب امرت سر میں پہنچا دیا جائے۔ تاکہ گرنتھ صاحب اس پر رکھا جایا کرے۔ صناعوں

سہ نواں کوٹ۔ باغبانپورہ وغیرہ۔

نے تخت کو اُکھاڑنا شروع کیا۔ مگر باوجود رنجیت سنگھ کی تاکید اور صناعوں کی بڑی احتیاط کے وہ تخت ٹوٹ گیا۔ اور کاریگروں نے کہہ دیا۔ کہ اس کا ثابت اُکھڑنا اور پھر قائم ہونا قریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی جگہ جس کو بعد میں لوہے کے شکنجہ سے جکڑا گیا ہے اب تک موجود ہے

زیب النساء کی مشہور رباعی

زیب النساء بیگم سنگِ مرمر کے اس تخت پر بیٹھ کر آبشار کی روانی و دوانی اور ترنم و نغمہ ریزی کے لطف اُٹھایا کرتی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے شاہی بیگمات اور حور وش کنیزوں کی مجلسوں میں وہ اپنے سحر طراز کلام سے دلوں کو مسخر کرتی تھی۔ اور اردگرد کے خوبصورت نظارے اس کے تخیل کی وسعت اور اس کے شاعرانہ جذبات کی جولانگاہ تھے شہنشاہ کا اس باغ کی تعمیر سے یہ مقصد بھی تھا۔ کہ شاہی حرموں کے لئے بھی کوئی تفرج گاہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ شاہی حرم کھلے اور آزادانہ طور پر باغ کے ہر طبقہ میں چل پھر سکتے تھے ؞

زیب النساء ایک مرتبہ پانی کی چادر (آبشار) کے دلکش نظارہ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کہ یکایک اس کے جذبات موجزن ہوئے اور اس نے آبشار کو مخاطب کر کے کہا ؎

اے آبشار نوحہ گر از بہرِ چیستی — چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی
آیا چہ درد بود کہ چوں ما تمام شب — سر را بہ سنگ میزدی و میگریستی

یہ رباعی کس قدر درد انگیز اثر اپنے چار مصرعوں کے اندر رکھتی ہے۔ اور قابل شہزادی کے خیالات کی بلند پروازی پتھر کی سل پر سے پانی کی روانی کے نظارہ کو کہاں سے کہاں تک لے گئی ہے۔ اس کو اہلِ دل اور سخن فہم بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

حوضِ کلاں اور اس کے فوارے اور بارہ دریاں

اس تخت سے آگے وہ حوضِ کلاں ہے جو بہت بڑے تالاب کا کام دیتا ہے اور جس میں میلہ کے دنوں میں لوگ نہاتے اور کودتے اور تیرتے اور فواروں کو کبھی کھولتے اور کبھی بند کرتے ہیں۔ تالاب کے عین وسط میں ایک چبوترہ ہے جس کی شرقی و غربی جانب تو ایک ایک بارہ دری ہے۔

اور شمال کیطرف ساون بھادوں اور جنوب کی طرف تخت اور بارہ دری کلاں ہے۔ تالاب
سے بارہ دریوں کے نیچے سے پانی گذرتا ہے۔ اور ان آبشاروں پر لہریں مارتا ہوا جو
ان بارہ دریوں کے نیچے بنی ہوئی ہیں۔ باغ کی تمام نہروں میں پھر جاتا ہے ؞

حوض میں جس کو عموماً تالاب کہتے ہیں۔ بیشمار فوارے ہیں۔ تاریخ لاہور (انگریزی)
کے مصنف نے شالامار کے تینوں طبقوں کے فواروں کی تعداد ساڑھے چار سو لکھی ہے
جس شخص نے کشمیر کی سیر کی ہے۔ اور وہاں ڈل کی دلفریب کیفیت کو دیکھا
ہے۔ اس کو اس تالاب کے کناروں پر ڈل کے گھاس کی تھوڑی سی جھلک نظر آئیگی
جو پانی کے نیچے اپنی سبزہ زار کیفیت خاموشی کے ساتھ بیان کر رہا ہے ؞

آبشار کلاں کا پانی اسی تالاب میں آکے جمع ہوتا ہے۔ جب گرمیوں میں فوارے
جمع ہوتے ہیں اور تمام تالاب میں پانی اچھلتا نظر آتا ہے۔ تو دلوں میں ایک عجیب
کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور باغ واقعی نمونۂ خلد بریں ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ
باغ ایک معمولی باغ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مغلیہ جاہ و جلال اور ہندوستان میں اسلامی
عظمت و شوکت کی ایک عالیشان یادگار دکھائی دیتا ہے ؞

ساون بھادوں کا نظارہ تالاب کی شمالی دیوار کے عین درمیان ساون بھادوں کا
مکان سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ جس کے مشرق و مغرب میں وہ خوبصورت بارہ دریاں
ہیں۔ جن کا سنگ مرمر فرش سے اکھاڑ کر اور دیواروں سے اتار کر رام باغ امرتسر
پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہ لوگ جو دولت۔ امارت اور حکومت و قوت کے رعب میں اپنے
آپ کو قانونی گرفت بلکہ قہر الہی کے عذاب سے بھی آزاد سمجھتے تھے بہت جلد اپنے کیفر
کردار کو پہنچ گئے ؞

مسلمانوں کی اس زمانہ میں حالت یہ تھی کہ کسی جگہ بلند آواز سے اذان بھی نہ
دے سکتے تھے۔ اپنی مقدس عمارتوں اور اپنے بادشاہوں کے عالیشان مکانات کو
تباہ و برباد ہوتے دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔

مریض ہیں کہ مرض کی خبر نہیں رکھتے ——— جگر میں درد ہے لیکن جگر نہیں رکھتے

ہر بارہ دری میں آٹھ در ہیں۔ چھت کشمیر کے نمونہ کا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ ساون بھادوں کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے اندر پانچ فوارے ہیں۔ وسط کا فوارہ باقی سب فواروں سے بڑا ہے۔ جنوبی۔ شرقی اور غربی دیوار میں چھوٹے چھوٹے محرابدار سنگ مرمر کے طاقچے چراغ رکھنے کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ ان طاقچوں میں رات کے وقت جب چراغ جلا کر رکھے جاتے ہیں اور پانی تالاب سے ہو کر طاقچوں میں آتا اور وہاں سے فواروں کے حوض میں گرتا ہے تو چراغوں کی شعاعیں وہ کیفیت پیش کرتی ہیں جو بارش کے دوران میں بجلی کی چکاچوند سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے تختہ میں بھی آم اور دوسری اقسام کے بہت سے درخت ہیں۔ مگر یہ تختہ اب درختوں سے بالکل صاف کر دیا گیا ہے۔

تیسرا تختہ یعنی باغ فرح بخش یہ تختہ جس کو پائیں باغ بھی کہتے ہیں۔ باغ حیات بخش کے نشیب میں ہے۔ اوپر کے دونوں باغوں کا پانی ساون بھادوں کے ذریعہ سے اس باغ میں سے ہو کر آگے نکل جاتا ہے۔ ساون بھادوں کے نشیب سے ایک مستطیل حوض کے بعد جس میں سات فوارے ہیں پہلے تختہ کی طرح فواروں کی ایک قطار شروع ہوتی ہے جس میں ۳۲ فوارے ہیں۔ ان فواروں کے بعد پھر ایک بڑا حوض پہلے تختہ کی طرح آتا ہے جس کے متصل ایک بہت چوڑا کنواں ہے۔

اس حوض میں قریباً تیس فوارے ہیں۔ اس کے شمال و جنوب کی طرف فواروں کی دو لائنیں جن میں بیس بیس فوارے ہیں، باغ کے آخری دروازوں تک جاتی ہیں۔ حوض سے بائیس فواروں کی ایک اور لائن شروع ہوتی ہے۔ جس کے انجام پر اس تختہ یا شالامار باغ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مہتابی باغ کو اسی باغ سے رستہ جاتا تھا۔ وہ رستہ (دروازہ) اب بھی موجود ہے۔ تینوں باغوں میں آم۔ لیموں۔ کھٹے۔ انار۔ سنگترے۔ ناشپاتی۔ کھجور کے بہت درخت تھے۔ درمیانہ تختہ یا باغ حیات بخش میں جہاں آبشار اور بارہ دریاں اور تخت شاہی اور تالاب کلاں ہے۔ اب درختوں سے بالکل خالی ہے۔ یہاں سے تمام درخت اکھاڑ

دیے گئے ہیں۔ اب صرف پہلے یا تیسرے تختہ میں کچھ درخت نظر آتے ہیں ؛

میلہ شالامار باغ کے شوقین لاہور میں چونکہ بزرگان اسلام کے مزارات بکثرت ہیں اس لئے ان کے عرسوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی میلوں کی وجہ سے لاہور کی یہ مشہور ضرب المثل "آٹھ دن اور نو میلے" بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ان میلوں اور عرسوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میلہ چراغان یعنی میلہ شالامار باغ کی شمولیت کے لئے اہل لاہور کو کیا کچھ اہتمام نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ باوجود باغ کی اس قدر وسعت کے میلہ کے دنوں میں وہاں قدم رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ شالامار کے اندر اور باہر چاروں طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ شالامار کے تیسرے یعنی آخری تختہ سے لیکر باغبانپورہ مزار مادھو لال حسین۔ بھوگی وال۔ سنگھ پورہ۔ سلطانپورہ۔ ریلوے سٹیشن کے نواحات اور دہلی دروازہ بلکہ لوہاری۔ بھاٹی تک آدمیوں کی یکساں کیفیت نظر آتی ہے۔ یہ پیدل رستے کا حال ہے ؛

سڑک پر اس سے بھی زیادہ رونق ہوتی ہے۔ بگھیاں ٹانگے۔ ٹم ٹمیں۔ موٹر۔ سائیکل اس کثرت سے چلتے ہیں کہ ان کا شمار حد و حساب سے باہر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ لاہور میں گاڑیوں اور ٹم ٹم تانگہ کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔ موٹر اور سائیکل ان کے علاوہ ہیں۔ بلکہ امرتسر۔ گوجرانوالہ۔ وزیر آباد اور سیالکوٹ تک کے مقامات سے صرف اسی میلہ کی خاطر تانگے اور ٹم ٹمیں لاہور میں آجاتی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ ان تین دنوں میں ہر تانگہ کو چالیس سے پچاس روپیہ آمدنی ہو جاتی ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر صرف گاڑیوں والے ہی ان تین دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کما کر لے جاتے ہیں ؛

لاہور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے مذہبی تہواروں اور میلوں کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی خوشی وہ میلہ شالامار کی محسوس کرتے ہیں۔ بلا مبالغہ ایک مہینہ پہلے تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ بازار میں جوتیاں۔ ٹوپے۔ ہر قسم کے کپڑے۔ کپڑوں کی سلائی سب کے نرخ بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے غریب آدمی بھی جن کو بعض اوقات ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل ملتی ہے۔ میلے کے دنوں میں نواب بن کر نکلتے ہیں ؛

میلۂ شالامار کی رونق

مسلمانوں اور سکھوں کے زمانہ میں میلہ صرف ایک ہی دن رہتا تھا۔ اور وہ بھی صرف ہفتہ کے دن۔ ہفتہ کی رات کو عُرس کی وجہ سے مزار مادھو لال حسین پر چراغاں کی رونق ہوتی تھی۔ اور دن کو تماشائی اور شوقین باغ کی سیر کا لطف اُٹھاتے تھے۔ انگریزوں کے ابتدائی دور میں بھی پہلے ایک ہی دن میلہ رہتا تھا۔ مگر حکام لاہور نے اس میلہ کی رونق بڑھانے کے لیئے اتوار کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد لاہور کے شوقینوں نے ہفتہ اور اتوار کے ساتھ جمعہ کا دن بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ اب ایک دن کی بجائے میلہ کی رونق تین دن تک رہتی ہے۔ اور ریل کی وجہ سے دُور دُور کے شوقین بھی آجاتے ہیں *

باغ کے ہر تختہ میں صدہا دوکانیں نظر آتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ہوٹل عارضی طور پر کھُل جاتے ہیں۔ بعض شوقین جمعہ کی سہ پہر کو باغ میں آتے ہیں۔ اور اتوار کی شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ خیمے۔ قناتیں۔ سائبان لگ جاتے ہیں۔ کہیں رقص و سرود کی محفل گرم ہے۔ کہیں ہارمونیم پارٹی کا لطف حاصل ہو رہا ہے۔ کہیں گراموفون کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔ تیسرے تختہ میں عام طور پر قلندر۔ مداری بازیگر۔ نٹ اور اسی قسم کے تماشہ کرنے والے نظر آتے ہیں *

تین دن تک سڑک پر اس قدر چھڑکاؤ ہوتا ہے کہ سال کے باقی ۳۶۲ دنوں کی کسر نکال دی جاتی ہے۔ گلابی باغ کے دروازہ میں پولیس کی عارضی چوکی قائم ہو جاتی ہے۔ باوجود بڑی احتیاط کے پھر بھی کوئی نہ کوئی حادثہ ہر سال ہو جاتا ہے۔

واقف کاروں کا بیان ہے۔ کہ شالامار کے میلہ میں ایک لاکھ سے کم مخلوق نہیں ہوتی۔ جس میں ہندو مسلمان اور سکھ اور دیگر قومیں یکساں شوق و رغبت سے شریک ہوتی ہیں۔ شوقین لوگ میلہ کی خاطر کپڑوں پر جو روپیہ خرچ کرتے ہیں اور جسقدر رقم کرایہ پر خرچ کی جاتی ہے اور جو میلہ کے اندر جا کر دوکانوں پر تفریحات اور کھانے پینے کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اور جس قدر رقم دوکانداروں کو زمین کے کرایہ کے لیئے دینی پڑتی ہے اس کے متعلق ایک واقف کار کا بیان ہے کہ یہ کل رقم دس بارہ لاکھ روپیہ سے کسی طرح

کم نہ ہوگی۔

باغ شالامار اور شاہانِ مغلیہ | شاہجہان کے زمانہ میں اس بےنظیر باغ کی جو حالت رہی ہے وہ باغ کے قطعہ تاریخ "نمونہ خلدِ بریں" سے ظاہر ہو رہی ہے۔ شاہ جہان کی زندگی میں دارا شکوہ نے بھی کہ پنجاب (لاہور اس کی جاگیر میں تھے۔ اس باغ میں اکثر مرتبہ جشن اور جلسے کئے ہیں۔ لیکن اس باغ میں اس کا آخری داخلہ اضطراب انگیز و حسرت خیز ہے۔ اس لئے اس کی کچھ کیفیت بیان کی جاتی ہے۔ شاہجہان کس شان و شکوہ سے ۱۰ شعبان ۱۰۵۲ھ کو اس باغ میں داخل ہوا تھا۔ اب اس کا ولیعہد اور عزیز بیٹا دارا شکوہ اس مصیبت و اضطراب کے ساتھ ۱۲ شوال ۱۰۶۸ھ کو باپ کی نظر بندی و معزولی کے بعد باغ کے پہلے تختہ فیض بخش میں آتا ہے۔ کہ عالمگیر اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ اور دارا شکوہ اور اس کا بیٹا سلیمان شکوہ اس سے اپنی جان چھپا رہے ہیں۔ پنجاب دارا شکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اور عزت خاں اس کا گورنر تھا۔ اس نے سپاہ و خزانہ سے مدد دی۔ استقبال کیا۔ سب کچھ کیا۔ مگر اقبال عالمگیری کے آگے شوکت دارائی کی کوئی پیش نہ گئی۔ دارا شکوہ چار دن تک فیض بخش میں رہا باغ میں اس کے دم سے رونق تو بہت تھی خیمہ و خرگاہ کی کثرت سے ایک شہر آباد تھا۔ لیکن سب کی ہوائیاں چھوٹی ہوئی تھیں۔ عالمگیر یلغار کرتا چلا آ رہا تھا۔ دارا نے جب اس کے آنے کی خبر سنی تو ملتان کی طرف بھاگ گیا۔ ۲۴ محرم ۱۰۶۸ھ کو عالمگیر اچھرہ میں قیام کر کے سیدھا شالامار باغ میں آیا۔ شاہزادہ معظم اور بڑے بڑے امراء ساتھ تھے۔ لوگ بھی ہوا کا رخ اور اس کا بڑھتا ہوا اقبال دیکھ رہے تھے۔ شان شوکت سے سب نے اس کا استقبال کیا۔ عالمگیر کو دارا شکوہ اور شجاع کا فکر لگا ہوا تھا۔ وہ خلیل اللہ خاں کو پنجاب کی صوبیداری تفویض کر کے محرم کی آخری تاریخ کو لاہور سے چلا گیا۔ اتنے دنوں میں صرف ایک مرتبہ ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں آیا۔ قلعہ کو دیکھا اور ظہر کی نماز مسجد وزیر خاں میں پڑھ کر پھر باغ میں واپس آ گیا۔

عالمگیر بھی اپنی طویل سلطنت کے دوران میں لاہور میں چند ایک مرتبہ آیا ہے۔

اور شالا مار ہی میں اُس نے قیام کیا ہے۔ مگر اُس کی عمر کا زیادہ حصّہ چونکہ دکن میں بسر ہوا ہے۔ اس لئے اس کی سب سے بڑی لڑکی زیب النساء اس باغ کو بہت رونق دیتی رہی ہے۔ وہ اپنی صدہا کنیزوں کے ساتھ ولوں اور مہینوں تک اس باغ کی پرکیف بہار کے لُطف اُٹھاتی رہی ہے۔ بلکہ اس نے خود بھی لاہور میں دو عالیشان باغ تعمیر کرائے ہیں۔ ایک باغ جو میا بائی کو دیدیا اور جس کا نام اب چوبرجی مشہور ہے۔ دوسرا باغ زیب النساء جہاں اب موضع نواں کوٹ آباد ہے۔

عالمگیر کے زمانہ میں شالا مار باغ اپنے پورے عروج پر تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا ہندو مصنف[۱] اس باغ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "اگرچہ در حواشیِ شہر فراواں باغ دلکشا و ہزاراں گلشن فرحت افزا است اما باغ شالا مار کہ حضرت شاہجہان بادشاہ بہ تقلید باغ کشمیر احداث فرمودہ اندو لفریب نظارگیاں است" (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۶)

بہادر شاہ اول بہ ایام شہزادگی کابل کی آمد و رفت کے وقت بارہا لاہور ٹھہرا ہے۔ اور ہر چند رہائش قلعہ ہی میں رہی ہے۔ لیکن بیگمات اور شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ اس نے اکثر مرتبہ سیر شالا مار سے تفریح طبع کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔

بہادر شاہ کی وفات ۱۷۱۲ء میں بعمر ۷۱ سال لاہور ہی میں ہوئی ہے۔ اس کی زندگی ہی میں سلطنت کے کل پرزے ڈھیلے ہو رہے تھے۔ اس کے بعد کوئی مغل بادشاہ دہلی کے مخمصوں سے باہر نہیں نکل سکا۔ یہ دہلی کا آخری بادشاہ تھا جس نے لاہور کے شالا مار باغ کو دیکھا ہے۔

| شالا مار باغ اور ناظمانِ لاہور |

فرخ سیر[۲] کے زمانہ میں جو عالمگیر کا پڑپوتا۔ بہادر شاہ[۳] کا پوتا اور عظیم الشان کا بیٹا تھا۔ جب ۱۷۱۲ء میں سکھوں نے پنجاب پر بے حد ظلم

---

[۱] منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی سنہ تالیف سال جلوس ۴۰ عالمگیری۔ [۲] فرخ سیر نے ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکومت کی تھی۔ کہ سادات نے جو بادشاہ گر اس زمانہ میں کہلاتے تھے۔ اس کو اندھا کر کے قتل کرا دیا۔ [۳] بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے۔ محمد معز الدین[۱] نے جہاندار شاہ نام رکھ کر دس ماہ تک بادشاہی کی۔ محمد عظیم الشان[۲] (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

وستم کرنے شروع کر دیئے۔ اور لاہور پر گوروبندا نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کو آگ
لگا دی اور بہت لوگوں کو قتل کر دیا۔ تو فرخ سیر نے سکھوں کی تادیب وتنبیہہ بلکہ تباہی
وبربادی کا عزم بالجزم کرکے نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو جو ناظم کشمیر بھی رہ
چکا تھا اس لئے لاہور کا گورنر مقرر کیا کہ وہ منتظم بھی ہے اور حضرت ایشان کے خاندان
سے بھی ہے۔ جن کا مقبرہ لاہور میں تمام مسلمانوں کے نزدیک قابل احترام ہے۔

جنگجو سکھوں کی تعداد اس زمانہ میں ۳۵ اور ۵۰ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ نواب
عبدالصمد خان نے جس کو سکھ ابو سمند خاں کہتے ہیں۔ ان پر دانہ گھاس اور غلہ یہاں تک
بند کیا۔ کہ یہ غول بیابانی بیل۔ گدھے گھوڑے تک کھا گیا۔ آخر بندا اور اس کے ۷۴۰
ہمراہیوں کو اونٹوں اور گدھوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار کرا کے ان کے سروں پر کاغذ کی
کی ٹوپیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر اپنے بیٹے ذکریا خاں
کی حفاظت میں دہلی روانہ کیا۔ جہاں یہ جماعت صحرائی جو عقل ورحم سے خالی اور ظلم
وغرور سے بھری ہوئی تھی تیغ کے گھاٹ اتاری گئی۔ بعہد محمد شاہ بادشاہ ۱۱۳۶ھ
کے قریب نواب عبدالصمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نواب ذکریا خاں خان بہادر
کے خطاب سے سرافراز ہو کر لاہور کا ناظم ہوا۔ نواب عبدالصمد خاں کے زمانہ میں شالامار
میں خوب رونقیں رہیں۔

نواب ذکریا خاں ناظم لاہور

نواب ذکریا خاں ناظم لاہور اور ناصرالدین محمد شاہ فرمانروائے
ہندوستان تھا۔ کہ نادرشاہ ایک امڈتے ہوئے دریا بلکہ ایک موج زن سمندر کی طرح
اٹک۔ جہلم اور چناب کے دریاؤں کو بغیر کسی کشتی یا پل کے عبور کرتا جہاں آباد پہنچا۔

خجستہ اختر جہاں شاہ۔ رفیع الشان۔ چاروں بھائیوں میں باپ کے بعد تلوار چلی۔ اور فیصلہ
لاہور کے باہر جنگ ہوئی۔ عظیم الشان شکست کھا کر ہاتھی پہ سوار ہو کر دریائے راوی سے
پار ہو رہا تھا۔ کہ دریا کی طغیانی میں ہاتھی سمیت اس کی تیز لہروں میں بہ گیا۔

جہاں ناظم لاہور کی فوج نے اس کا مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر واپس لاہور چلی آئی نواب ذکریا خاں نادر شاہ کی پیش بندی کے لئے دریائے راوی سے پار آیا۔ شاہدرہ کے قریب تین روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔ مگر یہاں بھی فتح و نصرت نادر شاہی کو نصیب ہوئی۔ ذکریا خاں نے۔ فرار ہو کر لاہور کے قلعہ اور شہر کو مضبوط کیا۔

نادر شاہ ایرانی شالامار میں

اور نادر شاہ دریا سے پار ہو کر شالامار باغ میں چلا آیا۔ یہاں خوب جشن کئے۔ فوج کا حوصلہ بڑھایا۔ اور لاہور پر ایک زوردار حملہ کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

دربار دہلی میں سازشوں کا بازار گرم تھا۔ اُمرائے دربار ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ خود بادشاہ عیش و عشرت میں یہاں تک محو تھا۔ کہ جب ناظم لاہور نواب ذکریا خاں کی عرضداشتیں نادر شاہ کے متعلق جاتی تھیں۔ تو حکم ہوتا تھا۔ ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولٰے۔ امداد اور کمک شاہی سے مایوس ہو کر ناظم لاہور نے نادر شاہ سے صلح کر لی۔ چنانچہ صلح کا عہدنامہ شالامار باغ میں مرتب ہوا۔ اور اسی جگہ یہ شرائط طے ہوئیں۔ کہ ناظم لاہور خود نادر شاہ کے پاس شالامار باغ میں آئے۔

وہ ذکریا خاں جو پنجاب کا قریباً خود مختار حاکم تھا۔ اور جو شالامار باغ میں شاہانہ جاہ و جلال سے آتا رہا تھا۔ دسمبر ۱۷۳۸ء میں اس حیثیت سے شالامار کے پہلے تختہ کی بارہ دری میں جہاں نادر شاہ زرنگار کرسی پر اپنے درباریوں کی مجلس میں اپنے مفتوح و مغلوب کا انتظار کر رہا تھا۔ آیا۔ کہ بیس لاکھ روپیہ نقد اس کے ساتھ تھا اور زنجیر فیل بطور نذرانہ ہمراہ تھے۔ نادر شاہ نے چند قدم استقبال کیا۔ اور اپنے پہلو میں دوسری کرسی پر اس کو بٹھایا۔ اور ایک خلعت فاخرہ عطا کر کے اور حکومت پنجاب اس کے نام پر بحال رکھ کر ۲۹ دسمبر ۱۷۳۸ء کو لاہور سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نواب یحییٰ خاں ناظم لاہور

اس واقعہ کے چار پانچ سال کے بعد نواب ذکریا خاں وفات پا گیا۔ اس وقت اس کا چھوٹا بیٹا شہنواز خان صوبہ ملتان تھا۔ اور بڑا بیٹا یحییٰ خاں لاہور میں تھا جو باپ کے بعد صوبہ لاہور مقرر ہوا۔

شالامار کے قریب جنگ

تھوڑے ہی دنوں کے بعد دونوں بھائیوں میں ... کا تنازعہ

شروع ہوا۔ جب نامہ و پیام ناکام رہے۔ تو شہنواز خاں فوج لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا۔ شالامار باغ میں اُس نے اپنا قیام کیا۔ اور فوج کو قرب و جوار میں پھیلا دیا۔ یحییٰ خاں بھی فوج لے کر باہر نکلا۔ مگر شکست کھا کر پہلے گرفتار ہو گیا اور پھر بھاگ کر دہلی جا پہنچا جہاں اس کا چچا اور خسر نواب قمرالدین خاں بادشاہ کا وزیر تھا۔ شاہنواز خاں نے دربار دہلی کی اجازت کے بغیر ہی لاہور کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور اس خوشی و مسرت میں شالامار میں ایک عظیم جشن کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۴۶ء کے آخری زمانہ کا ہے ؀

نواب میر معین الملک ناظم لاہور محمد شاہ کے عہد آخر میں احمد شاہ ابدالی کو سرہند کے قریب جو شکست مارچ ۱۷۴۸ء میں ملی ہے۔ وہ مغلِ اعظم کی اولاد کی آخری فتح و نصرت ہے۔ اس جنگ میں نواب قمرالدین خاں وزیر اس کا بیٹا نواب میر معین الملک اور ولی عہد سلطنت احمد شاہ بھی شامل تھے۔ وزیر تو مارا گیا۔ مگر اس کے بیٹے نے اپنی شجاعت و قابلیت کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں پنجاب اور ملتان کا ناظم مقرر ہو گیا ؀

شہزادہ احمد شاہ اور میر معین الملک احمد شاہ ابدالی کی جنگ میں بمقام سرہند دوش بدوش اپنے دشمن کے ساتھ نبرد آزما رہے تھے۔ اس لئے جب اپریل ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ تخت پر بیٹھا تو معین الملک کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا تھا۔ کہ اپنے مدارالمہاموں مصاحبوں اور درباریوں کو اعلےٰ اعلےٰ خطاب وہ اپنے اختیار سے دیتا تھا اور بادشاہ کی طرف سے کوئی پُرسش نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے دیوان اور مدارالمہام کوڑا مل کو پہلے دیوان کا خطاب دیا اور جب دیوان نے اس کے بھائی شاہنواز خاں کو ایک جنگ میں قتل کر دیا۔ تو اسے مہاراجہ کا خطاب عطا کر کے ملتان کا گورنر بنا دیا ؀

یہ خودمختاری یہاں تک بڑھی کہ نواب میر معین الملک نے جس کو اہلِ لاہور نواب میر منّو کہتے ہیں۔ ۱۷۴۸ء کے آخر میں جو عہد و پیمان احمد شاہ ابدالی کے ساتھ کئے تھے سب بالائے طاق رکھ دیئے۔ احمد شاہ ایک جرار فوج لے کر بخطِ مستقیم لاہور آیا۔ اور مار دھاڑ کرتا راوی سے پار ہو گیا ؀

احمد شاہ ابدالی شالامار میں احمد شاہ ابدالی کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ اس نے اپنے ڈیرے خیمے

شالامار میں لگائے اور لاہور کے محاصرہ کی تیاریاں شروع کیں۔ چار مہینے تک طرفین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ میر منّو قلعہ اور فصیل شہر کے اندر بند تھا۔ اور ابدالی شالامار میں جشن کرتا اور ارد گرد کے مواضعات کو لوٹتا اور تباہ کرتا تھا۔ آخر رسد رسانی کی قلت سے تنگ ہو کر ۱۲-اپریل ۱۷۵۲ء کو میر منّو اپنے مورچوں سے باہر نکلا۔ اور موضع محمود بوٹی کے قریب دونوں فوجوں میں ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ جب نواب کا دیوان مہاراجہ کوڑامل جو اپنے ولی نعمت کا جاں نثار خیر خواہ تھا۔ اس لڑائی میں مارا گیا تو نواب کی فوج بیدل ہو گئی۔ دوسرے دن میر منّو نے جنگ بیفائدہ سمجھ کر درانی بادشاہ کے پاس شالامار باغ میں اپنے معتبر صلح کا پیغام دیکر بھیجے۔ اور بادشاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ابدالی نے اپنے دربار کے معزز امیر جہان خاں کو میر منّو کے استقبال کے لئے بھیجا۔ بارہ دری میں جو آب شار کے اوپر پہلے تختہ میں ہے دو تخت بچھائے گئے۔ بادشاہ میر معین الملک کے آنے پر بسر وقد ایستادہ ہوا۔ اور اس کی شجاعت و بہادری کی کمال تعریف کی۔ آخر بہت سی باتوں کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی۔ کہ ناظم لاہور بادشاہ کو پچاس لاکھ روپیہ نقد اور چند راس اسپ معہ زین طلائی اور چند زنجیر فیل معہ ہودج نقرہ پیش کرے۔ میر منّو نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور احمد شاہ نے جالندھر۔ لاہور اور کوہستان کی سند حکومت اسے لکھ دی۔ اور خلعت قیمتی سوا لاکھ روپیہ معہ ایک ہیش بہا مرصع کارتلوار کے عطا فرمایا۔

سکھ سردار حاکمان لاہور کا زمانہ

احمد شاہ ابدالی کے چوتھے حملۂ پنجاب ۱۷۵۶ء کے بعد سکھ پھر جنگلوں اور جھاڑیوں سے باہر نکلے۔ اس موقعہ پر ان کا سردار جسا سنگھ کلال قوم کا ترکھان تھا۔ اس نے مغلوں کے دار الضرب واقعہ لاہور پر قبضہ کر کے حسب ذیل سکہ اپنے نام کا چلایا۔ "سکہ زد بفضل خالصہ بملک احمد شاہ مفتوحہ جسا کلال"۔ یہ سب سے پہلا سکہ تھا۔ جو سکھوں نے جاری کیا۔ جب احمد شاہ ابدالی کو سکھوں کی اس قسم کی خبریں ملیں تو ۱۷۶۲ء میں وہ پھر ان کی گوشمالی کے لئے کابل سے نکلا۔ سکھ حسب دستور پھر فرار ہو گئے۔ مگر احمد شاہ نے ان کو ستلج کے پار جا پکڑا۔ جہاں فروری ۱۷۶۲ء میں سکھوں کا قتل عام ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس لڑائی میں جو لودھیانہ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر گوجرال

وبرنالہ کے درمیان ہوئی ہے۔ بارہ ہزار سے زیادہ سکھ تہ تیغ ہوئے +

اسی اثنار میں اُسے بغاوتِ قندھار کی خبر ملی۔ وہ آلا سنگھ کو بعوض سات لاکھ روپیہ پٹیالہ کا راجہ اور دیوان کابلی مل کو صوبہ لاہور مقرر کرکے واپس چلا گیا۔ سکھوں نے پھر سر نکالا۔ اور ان کی مشہور بارہ مثلوں میں سے بھنگیوں کی مثل نے گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے ماتحت مضافات کو لوٹنے کے بعد لاہور پر حملہ کیا۔ کابلی مل کئی ماہ تک جنگ کرتا رہا۔ آخر مقابلہ کی تاب نہ لایا اور بھاگ گیا۔ دوسرے دن بھنگی مثل والوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا +

ان کے بعد احمد شاہ ابدالی اور تیمور شاہ پسر احمد شاہ اور شاہ زمان نے سنہ ۱۷۹۹ء تک پنجاب پر کئی حملے کئے۔ لیکن سکھ اب زور پکڑ رہے تھے۔ اور رنجیت سنگھ نشو و نما پا رہا تھا۔ اس لئے سب حملے قریباً ناکام رہے +

سنہ ۱۷۵۶ء سے سنہ ۱۷۹۹ء تک یعنی کامل ۴۳ سال پنجاب بالخصوص لاہور و مضافات لاہور کے لوگ اور ان میں بھی بدنصیب مسلمان ہمیشہ مصائب و آلام کا شکار رہے۔ جن تین بھنگی مثل کے سرداروں نے لاہور کو فتح کیا تھا۔ انہوں نے لاہور کو حسب ذیل حصص میں تقسیم کر لیا :-

گوجر سنگھ بھنگی کے قبضہ میں لاہور کا وہ علاقہ تھا۔ جو شالا مار باغ اور لاہور کے درمیان واقعہ ہے۔ گوجر سنگھ کا قلعہ اسی سردار کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور پر جب رنجیت سنگھ نے قبضہ پایا ہے۔ تو گوجر سنگھ کا بیٹا صاحب سنگھ باپ کا جانشین تھا +

دوسرے حاکم کا نام لہنا سنگھ تھا۔ حملۂ رنجیت سنگھ کے وقت اس کا بیٹا چیت سنگھ اپنے علاقہ شہر اور قلعہ پر قابض تھا +

تیسرا حاکم سوبھا سنگھ تھا۔ اس کے قبضہ میں لاہور اور باغ زیب النسار یعنی نواں کوٹ کا درمیانی علاقہ تھا +

سہ حاکمانِ لاہور کے زمانہ میں شالا مار کی تباہی شروع ہوتی ہے۔ لہنا سنگھ ہی وہ حاکم ہے جس نے سنگِ یشب کا حوض نکلوا کر ۷۵ ہزار اور بقولِ جج محمد لطیف مورخ لاہور

۲۲ ہزار کو جگا کوں کے پاس فروخت کر دیا تھا۔

رنجیت سنگھ اور شالامار

رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کیا۔ اور شروع ۱۸۰۶ء تک اس نے بہت سی فتوحات حاصل کر لیں۔ جب جنگی کاموں سے ذرا مہلت ملی۔ تب یعنی اپریل ۱۸۰۶ء میں دو وجوہات سے شالامار باغ کی طرف توجہ کی۔ ایک تو یہ کہ باغبانپورہ کے رؤساء نے لاہور کا قبضہ دلاتے وقت رنجیت سنگھ سے شالامار باغ کی حفاظت و مرمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ اور دوسرے اس خیال سے کہ آخر وہ ایک اعلیٰ ترین بادشاہی مقام ہے۔ باغ کی اکثر جگہ سے مرمت کرائی گئی۔ اور اس نہر کو جو ناظمان لاہور کے بعد سکھ سرداروں کے حسن انتظام اور مذاق سلیم کی وجہ سے قریباً پچاس سال سے بند چلی آتی تھی۔ از سرِ نو جاری کرایا۔ اور باغ میں پھر وہی رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی۔

رام باغ امرتسر اور دربار صاحب

امرتسر چونکہ سکھوں کا مذہبی مقام ہے۔ اس لئے رنجیت سنگھ اکثر وہاں جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی دن وہاں رہتا تھا۔

امرتسر میں شالامار باغ کا سنگ مرمر

جب تمام پنجاب بلکہ شمال کیطرف پشاور تک اس کا قبضہ ہو گیا۔ اور مغربی پنجاب کے تمام مسلمان رؤسا اور قصور۔ مالیر کوٹلہ۔ ملتان۔ بہاولپور وغیرہ کے تمام مسلمان والیان ریاست اس سے خوف کھانے لگے۔ تو باغبانپورہ والوں کی کیا طاقت تھی۔ کہ وہ رنجیت سنگھ کو شالامار کی حفاظت و مرمت کے وعدوں کا پابند بنا سکتے۔ چنانچہ جب امرتسر کے دربار صاحب اور رام باغ کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں۔ اور ان میں سنگ مرمر لگایا جانا تجویز ہوا۔ تو لاہور کی دیگر اسلامی عمارتوں اور مقبروں کی طرح شالامار باغ کی بھی شامت آئی۔ یہاں کی بارہ دریوں کے فرش جو سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے تھے۔ اتار کر امرتسر پہنچا دیے گئے۔ اور شالامار باغ اور لاہور کی دیگر شاہی عمارات کو اجاڑ کر امرتسر کا رام باغ اور دربار صاحب آباد کیا گیا۔

شالامار باغ میں عظیم الشان جشن

رنجیت سنگھ نے اوائل مارچ ۱۸۳۷ء میں اپنے پوتے یعنی شہزادہ کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ کی شادی پر علاوہ راجگان جنوبی پنجاب و کوہستان اور دیگر جاگیردار اور امراء کے گورنر جنرل سر چارلس مٹکاف

اور سر ہنری فین کمانڈر انچیف افواج ہند کو بھی دعوت دی - انگریز مہمانوں میں سے صرف آخر الذکر ۶ مارچ ۱۸۳۷ء کو امرتسر آئے - جہاں سے برات شام سنگھ اٹاری والا کے ہاں جانے والی تھی ۔ یہ شادی پنجاب میں عہد رنجیت سنگھ کی بہت بڑی یادگار ہے ۔ دیگر اخراجات شادی کے علاوہ صرف غرباء ہی کو گیارہ اور بیس لاکھ روپیہ کے درمیان خیرات کیا گیا تھا ۔ تنبول کی رقم پچاس لاکھ روپیہ تھی ۔ سپہ سالار ہند نے پندرہ ہزار روپیہ دیا تھا ۔

شادی کے کاروبار سے فارغ ہو کر رنجیت سنگھ سر ہنری فین سپہ سالار افواج انگلشیہ کو شالامار کی سیر کرانے کے لئے لاہور لایا - اور ایک دن اور ایک رات دونوں معہ اپنے درباریوں اور افواج کے باغ ہی میں رہے ۔ اعلیٰ پیمانہ پر مہاراجہ نے اپنے معزز مہمان کی دعوت کی ۔ رجمنٹ ۳۱ پیدل انگریزی اور مہاراجہ کی فوج کے باجہ نواز باری باری سے باجہ سنا کر حاضرین کو مسرور کرتے تھے ۔ محفل رقص و سرود جس میں لاہور و امرتسر کی منتخب طوائفین شامل تھیں تمام شب گرم رہی ۔ اور جیسا کہ اس قسم کی شاہانہ محفلوں کا دستور ہے ۔ شراب انگوری کا دور برابر جاری رہا ۔

شالامار میں آتش بازی اور چراغاں

مہاراجہ نے بڑے اہتمام سے روشنی اور آتش بازی کا سامان کیا ۔ حوضوں اور آبشاروں کے کناروں سے لے کر بے شمار گنجان درختوں کی چوٹیوں تک چراغوں کی روشنی دکھائی دیتی تھی ۔ درختوں کی ٹہنیوں میں رنگ برنگ کی قندیلیں آویزاں کرائیں ۔ اور ایک ایک درخت کے ساتھ روشنی کی پچاس پچاس ہانڈیوں کا انتظام کیا گیا ۔ حوضوں کے گرد چراغوں کی دو طرفہ قطاریں کمال لطف دکھاتی تھیں ۔ اور جب ان کی جھلک پانی میں پڑتی تھی ۔ تو عجیب طرح کا عالم نظر آتا تھا ۔ اسی طرح قندیلوں اور ہانڈیوں کی روشنی میں میوہ دار درختوں کے سرسبز پتے اور ان کی ہری ہری شاخیں آنکھوں کو ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں

؎ از تاریخ پنجاب مطبوعہ ۱۸۹۱ء مصنفہ خان بہادر سید محمد لطیف جج مرحوم ۔

کو دیکھنے والے کے دل سے وہ لطف کبھی فراموش نہیں ہو سکتا ۔

مہاراجہ اپنے معزز مہمان کے ہمراہ بارہ دری کلاں میں جو آبشار کلاں کے سر پر شالامار کے پہلے تختہ میں ہے ۔ بیٹھے ہوئے باغ کی تمام کیفیت ملاحظہ کر رہے تھے ۔ ان کے قریب ہی ایک بلند چبوترہ پر لیڈیوں کے لئے نشستگاہیں بنائی گئی تھیں ۔ بارہ دری کے اندر ہی تمام سردار اُمراء وغیرہ آتشبازی اور روشنی کا تماشا دیکھ رہے تھے ۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ایک انگریز سیاح کا قیام شالامار میں

۱۸۲۳ء میں ایک انگریز سیاح ہنری مورکرافٹ مہاراجہ کے دربار میں آیا جس نے کشمیر، تبت، بخارا، ثمرقند وغیرہ کا سفر بھی کیا ہے ۔ اور جس کو مہاراجہ کے حکم سے دیوان موتی رام ناظم کشمیر نے اُس کے اغراض کے لئے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی تھی ۔ ۱۸۳۰ء میں کہ ابھی مہاراجہ زندہ تھے اس نے واپس لنڈن میں جا کر اپنا سفرنامہ چھپایا ۔ جو بہت مشہور ہوا ۔ اسی سفرنامہ میں صفحہ ۹۱ پر مورکرافٹ نے شالامار باغ کا کچھ ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے ۔ میں ۲۰ مئی کو لاہور پہنچا ۔ مہاراجہ نے شالامار باغ میں جو شاہجہان کا بنایا ہوا ہے ۔ میرے لئے ایک خیمہ نصب کرایا ۔ وہ خیمہ کہاں تھا ۔ مورکرافٹ لکھتا ہے "میرے خیمہ کے پاس ایک کنواں تھا ۔ اور اس کے پاس ہی ایک وسیع تالاب تھا جس سے فوارے علی التواتر چلتے تھے اور جن سے ہوا نہایت سرد ہو جاتی تھی" ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اس کا خیمہ باغ کے پہلے ہی تختہ دو بارہ دری کے متصل تھا جس کے نیچے آبشار اور فوارے اور ساون بھادوں اور وسیع تالاب ہے ۔ کنوئیں کے اوپر جو بارہ دری ہے ۔ اسپر سیاہ ذکور کا نام لکھا ہوا ہے رنجیت سنگھ نے اس باغ کی بہت کچھ مرمت کرائی ہے ۔ باغ کی چار دیواری کے اندر متعدد عالیشان عمارتیں ہیں ۔ ساون بھادوں کا نظارہ نہایت دلفریب ہے ۔ شام کو وہاں چراغ جلائے جاتے ہیں ۔ اور سب پانی کی بوندیں ان کے اوپر سے گذرتی ہیں اور قطرہ قطرہ ہو کر واپس آتی ہیں تو نہایت لطف پیدا ہوتا ہے ۔

باغ کی سطح گیلری کی طرح درجہ بدرجہ بنائی گئی ہے۔ اور ہر طبقہ اور درجہ میں ثمردار درخت بکثرت لگے ہوئے ہیں۔ اس باغ کے لئے اتنی کوس کے فاصلہ سے پانی آتا ہے۔ دروازے تمام چینی کے بنے ہوئے ہیں۔ یعنی مٹی پر چینی کا کام ہے۔ بعض مقامات پر خوبصورت سنگ مرمر کے نقشی پتھر پائے جاتے ہیں۔

رنجیت سنگھ اور موراں طوائف کے عشق کا تعلق شالامار باغ سے

رنجیت سنگھ باغات اور گل و گلزار کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے کبھی کبھی شالامار کی سیر کو آ نکلتا تھا۔ امراء وزراء سب جلو میں ہوتے تھے۔ اور رنگیلے مہاراجہ کی خوش طبعی کا لطف اٹھاتے تھے۔ مہاراجہ بسنت، دسہرہ اور ہولی کے تیواروں پر بھی اس باغ میں آتا تھا۔ اور جس جاہ و جلال سے آتا تھا اس کا تصور آج خواب میں آنا بھی دشوار ہے۔ نوخیز حسین رنڈیاں باغ فرح بخش کی بارہ دری کو اندر کا اکھاڑہ بنا دیتی تھیں اور اپنے دل آویز نغموں سے مہاراجہ کے دل کو خوش کرتی تھیں۔ بسنت کے ایک موقع پر شالامار باغ میں اسی قسم کا ایک جشن ہو رہا تھا۔ بارہ دری میں لاہور و امرتسر کی مشہور خوبصورت طوائفیں مجمع کو پرستان بنا رہی تھیں۔ کہ مہاراجہ نے ایک نوجوان خوش قسمت طوائف کو جو سراپا حجاب بنی دیکھا۔ تیر نگاہ کلیجہ سے پار ہو گیا۔ حکم دیا۔ سوائے اس طوائف کے باقی تمام طوائفوں کو انعام و اکرام دیکر رخصت کر دو۔ اس کا نام موراں تھا۔

یہ وہ موراں ہے جس کے نام پر شاہ عالمی دروازہ کے اندر ایک مسجد بنام مسجد موراں اور لاہور کے متصل ایک موضع موراں والا ایک چاہ موراں والا اور ایک باغ موراں والا مشہور ہے۔ اور جس نے یہاں تک مہاراجہ پر قابو پا لیا تھا کہ موراں کے نام کا سکہ بھی پنجاب میں چل گیا۔ اور مہاراجہ کے دربار کے بڑے بڑے مغرور و معزز مصاحب اور مونچھوں پر تاؤ دینے والے سردار موراں کی کفش برداری کی عزت دو جہان کی نعمت سے کم نہ سمجھتے تھے۔ غرض اسی باغ سے مہاراجہ اور موراں کے عشق و محبت کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔

مہاراجہ شیر سنگھ کی فوجکشی شالامار باغ پر

مہاراجہ کھڑک سنگھ کے زمانہ میں شالامار باغ کے متعلق کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ جب ۱۸۴۱ء میں شہزادہ شیر سنگھ پنجاب کا فرمانروا ہوا۔ تو اس نے اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ نے سوار اور پیدل فوج کی تعداد کثیر کے ساتھ شالامار باغ پر فوجکشی کی جس کی مختصر سی کیفیت اس طرح ہے۔ کہ مہاراجہ شیر سنگھ کا ایک معتبر اور جان نثار سردار جوالا سنگھ نام تھا۔ مہاراجہ نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر ہم خاندان ڈوگرہ کی مدد کے بغیر لاہور اور قلعہ پر قابض ہو گئے تو مدار المہامی کی سند تمہارے نام لکھ دی جائیگی۔

اس قسم کی باتیں راجہ دھیان سنگھ کے دل میں کھٹک رہی تھیں۔ اس نے مہاراجہ کو جوالا سنگھ کی طرف سے بھڑکانا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک کامیاب ہو گیا کہ مہاراجہ اپنے قدیمی خیرخواہ کو اپنا جانی دشمن تصور کرنے لگا۔

مہاراجہ ایک مرتبہ غم و غصہ کے اضطراب میں تھا۔ کہ دھیان سنگھ نے موقعہ مناسب دیکھ کر جوالا سنگھ کے متعلق کچھ جھوٹ موٹ کہہ دیا اور اس قسم کی خانہ ساز باتوں کا طوفان اُٹھایا جس سے مہاراجہ اور بھی بھڑک اُٹھا اور حکم دیا۔ کہ جوالا سنگھ کو ابھی دربار میں حاضر کرو۔ جوالا سنگھ اُس وقت اپنے چھ ہزار سواروں کے ساتھ شالامار باغ کے اندر مقیم تھا۔ اس نے مہاراجہ کی نیت بہ خیر نہ سمجھ کر حاضری سے انکار کر دیا۔ راجہ دھیان سنگھ نے اس پر اور بھی نمک چھڑکا۔ اور مہاراجہ کو اس پر فوجکشی کرنے کے لئے آمادہ کیا چنانچہ مہاراجہ اور وزیر دونوں ایک جرار فوج لیکر شالامار باغ کیطرف گئے۔ جوالا سنگھ نے جب سُنا کہ مہاراجہ فوج کثیر لیکر آ رہا ہے تو وہ خود مہاراجہ کے کیمپ میں حاضر ہو گیا اور اسطرح شالامار باغ میں جو خونریزی ہونیوالی تھی وہ رک گئی۔

مہارانی جنداں شالامار باغ میں

جب مہاراجہ شیر سنگھ کے قتل کے بعد رانی جنداں والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ اپنے صغیر سن بیٹے کی سرپرست قرار پائی۔ تو اُس نے اور اُس کے منظور نظر نوجوان امیر راجہ لال سنگھ نے سکھ سپاہ کی طاقت کو توڑنے بلکہ اُس کو تباہ کرنے کیلئے یہ تجویز سوچی کہ اس کو انگریزوں کے خلاف اشتعال دلا کر آمادہ جنگ کر دیا جائے۔ تاکہ یہ خود سر اور بے لگام فوج جو ذاتی طمع اور لوٹ مار کیلئے نہ کسی راجہ کا ادب کرتی

ہے نہ کسی وزیر کا۔ نہ ملک کے ناموس کا اس کو خیال ہے اور نہ رعایا کے تباہ ہونے کا۔ سیدھی ہو جائے ؎

اس تجویز کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے بہت سی جعلی چٹھیاں بنائی گئیں اور تمام ملک میں مختلف ذرائع سے ان کی تشہیر کی گئی تاآنکہ جب عام سکھوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ایک جوش پیدا ہو گیا۔ اور فوج لڑنے مرنے کے لئے تیار نظر آنے لگی۔ تو راجہ لال سنگھ اور رانی جنداں نے کل سرداروں۔ افسروں اور فوج کے پنچوں کا شالامار باغ میں ایک دربار منعقد کیا جس میں دیوان دینا ناتھ (بعہد انگریزی راجہ دینا ناتھ) نے اس مضمون کی ایک چٹھی پڑھی " انگریزوں کا پختہ ارادہ ہے کہ ستلج پار ہو کر سکھوں کے ملک میں شورش پیدا کریں۔ اور آخر اس سب سرسبز ملک پر قبضہ کر لیں۔ دربار لاہور کے جو کاردار ستلج پار مقیم ہیں۔ انگریز ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔ انہوں نے دیہات کے لوگوں کو یہ حکم بھی دیدیا ہے۔ کہ وہ آیندہ معاملہ یا خراج سکھوں کی بجائے انگریزوں کو دیا کریں گے۔ دیوان دینا ناتھ نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ پیشاور اور کشمیر وغیرہ دور دراز حصص ملک میں غدر مچا ہوا ہے۔ ایک عرصہ سے وہاں سے مالیہ کی رقم نہیں آئی۔ ہمارا بادشاہ بھی ایک صغیر سن لڑکا ہے۔ جب تک کوئی سرکردہ نہ ہو گا۔ اور امورات سلطنت کی انجام دہی کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ اتنی بڑی مملکت کا کام کس طرح چلیگا۔ اس لئے مہارانی جنداں کا یہ منشا ہے کہ راجہ لال سنگھ کو وزارت اور سردار تیجا سنگھ (بعہد انگلشیہ راجہ تیجا سنگھ) کو سپہ سالاری کا عہدہ دیا جائے۔ مہارانی یہ بھی چاہتی ہیں۔ کہ سپاہ خالصہ ستلج پار ہو کر انگریزوں کو کافی سزا دے۔ اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی لاج قائم رکھے "۔

اس تقریر کے جواب میں کل سرداروں اور پنچوں نے جوش و خروش کا اظہار کیا راجہ لال سنگھ اور سردار تیجا سنگھ نے اپنی اپنی تقریروں میں فوج خالصہ کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہو گیا ؎

؎ یہ چٹھی رئیسان پنجاب مولفہ سر لیپل گریفن میں مفصل درج ہے ؎

رانی جنداں جلسہ کے بعد بھی دو تین دن تک شالامار باغ میں مقیم رہی۔ اور وہاں اپنی کنیزوں لونڈیوں اور اپنے معتبروں کے ساتھ صلاح و مشورے کرتی اور داد عشرت دیتی رہی۔ یہ واقعہ جو نہ صرف سکھ فوج بلکہ سکھ سلطنت کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اوائل نومبر ۱۸۴۵ء کا ہے ۔

سرکار انگریزی اور شالامار باغ — الحاق پنجاب (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء) کے بعد سرکار انگریزی نے جس طرح اس اُجڑے ہوئے ملک کو آباد کرنے اور مخلوق خدا کو متعصب حاکموں کے ظلم و تعدی سے بچانے کا اعلان کیا۔ اسی طرح لاہور کی قدیمی عمارات خصوصاً شالامار باغ کی رونق و آبادی کیطرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ اب تک شالامار کی مرمت کے لئے ہر سال معقول رقم منظور ہوتی ہے ۔

مسلمانوں اور سکھوں کے زمانہ میں میلہ صرف ایک ہی دن رہتا تھا۔ مگر سرکار انگریزی نے اس میلے کے لئے دو دن مقرر کر دیئے۔ اور محض اسی میلہ کی خاطر ایک دن کی چھٹی سرکاری دفاتر میں منظور کی۔ اور گھوڑوں کی منڈی بھی اسی میلے کیساتھ مقرر کر دی۔ جہاں اچھے اچھے گھوڑوں کو انعام بھی ملتا تھا۔ اور بعض خاص نسل کے گھوڑے بڑی بڑی قیمت بھی پاتے تھے ۔

جب جنوری ۱۸۷۶ء میں پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم آنجہانی) اور ان کے بعد امیر کابل لاہور میں آئے تو شالامار باغ میں اس قدر روشنی کی گئی تھی۔ کہ یہ باغ ایک نوری باغ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی شب تار میں اس وقت وہ روشنی تھی کہ روز روشن کو اس سے شرم آتی تھی ۔

جس قدر والیسرایان ہند لاہور آتے رہے ہیں۔ اُن سب نے اس عالیشان باغ کی سیر کی ہے۔ جب ۱۸۹۴ء میں لارڈ ایلجن لاہور آئے تھے۔ تو راقم الحروف[1] کو خوب یاد ہے۔ کہ پندرہ بیس دن پہلے ہی باغ میں عوام الناس کو جانے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اور کئی دنوں تک باغ کی صفائی اور مرمت ہوتی رہی تھی۔ اسی طرح جب ۱۹۰۵ء

[1] مصنف کتاب ہذا اس زمانہ میں لاہور پڑھتا تھا۔

ہیں لارڈ کرزن جو آجکل انگلستان کے وزیر خارجہ[۱] ہیں اور اُس زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے تھے لاہور آئے۔ تو شالا مار باغ کی عمارتوں میں بہت کچھ مرمت اور باغ کے وسیع احاطہ میں بہت کچھ صفائی ہو گئی تھی۔ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خان مرحوم والئی کابل جب ۱۹۰۷ء کے اوائل میں سیاحت ہند کو آئے۔ تو بہ ایام قیام لاہور ۴ مارچ کو صبح دس بجے شالا مار باغ میں بھی گئے۔ سر ہنری میک موہن اور دیگر درباری آپ کے ہمراہ تھے۔ قاضی غلام ربانی صاحب مرحوم خان بہادر نے جو ہز مجسٹی کے سیر شالا مار باغ کے مہتمم تھے۔ باغ کے تمام تختے ہز مجسٹی کو دکھائے۔ ایک بجے بعد دوپہر امیر صاحب موٹر پر سوار ہو کر واپس آ گئے ؏

بارہ دری کا چاہ بالکل ویران پڑا رہتا تھا۔ اب گورنمنٹ کی توجہ سے اس کی مرمت ہو گئی ہے۔ اس سے پانی نکالنے کے لئے ایک انجن لگا دیا گیا ہے۔ جو ہفتہ میں تین مرتبہ چلتا ہے۔ اور جس سے فواروں میں پانی پہنچایا جاتا ہے ؏

موجودہ شہنشاہ ہندوستان و شاہ انگلستان یعنی ملک معظم جارج پنجم بھی زمانہ شہزادگی میں شالا مار باغ میں رونق افروز ہوئے تھے۔ باغ اس موقعہ پر بے حد سجایا اور آراستہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح ان کے ولیعہد موجودہ پرنس آف ویلز بھی ۱۹۲۱ء کی سیاحت ہند میں شالا مار باغ کی سیر سے محظوظ ہو چکے ہیں ؏

شالا مار باغ لاہور شاعروں کی نظر میں

شالا مار باغ کی سیر کے بعد کئی اہل دل شعراء نے اُس کیفیت کو جو اُن کے دلوں نے محسوس کی تھی کلام موزوں (نظم) کے ذریعہ ظاہر کیا ہے میں یہاں صرف دو نظمیں لکھتا ہوں۔ جو دوران ترتیب کتاب ہذا میں مجھے ملی ہیں ؏

---

[۱] ۲۲ نومبر ۱۹۲۳ء کو لیبر پارٹی کے برسرِ اقتدار آ جانے اور اس کے لیڈر مسٹر ریمزے مکڈانلڈ کے وزیر اعظم مقرر ہو جانے سے لارڈ کرزن کو وزارت خارجہ سے بوریا بستر اٹھانا پڑا۔ آج کل آپ نپولین بوناپارٹ کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں ؏

(از ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب بسمل ہوشیارپوری)

چل رہی ہے گلشن عالم میں عبرت کی ہوا — آ رہی ہے ہر گل خوش رنگ سے بوئے فنا
نغمۂ حسرت ہے وہ جو عندلیب خوشنوا — غنچۂ لب بستہ سے پیدا ہے ماتم کی صدا
قمری کو کو نواء کی گفتگو سے ہے عیاں
ہائے پہلا سا ہے اب وہ منظر دلکش کہاں

سوز و ساز نغمۂ مرغان خوش آہنگ تھا — سرو تھا طنبور ہر برگ شجر اک چنگ تھا
رقص طاؤسان بستان کا نرالا ڈھنگ تھا — لالہ ہم کیفیت جام مے گل رنگ تھا
تھی صبا مجرائی دربار شاہنشاہ گل
مرجع بلبل نگاہاں تھی کبھی درگاہ گل

کیا غضب ڈھایا یہ تو نے حیف اے دور زماں — کر دیا اس جنت ارضی کو پامال خزاں
اب نہ وہ سنبل نہ وہ لالہ نہ وہ سرو چماں — تختہ ہائے گل اڑائے صورت تخت رواں
اے فلک کیا تھا اسی صورت میں یہ شہوار باغ؟
یوں ہی بے برگ و نوا تھا آہ! شالامار باغ؟

منتخب تھا اس چمن زار جہاں میں یہ چمن — تھے ثنا خوانوں میں لاکھوں لالہ رخ غنچہ دہن
گلشن آرا تھے ہزاروں سرو قد گل پیرہن — خود ہوا خواہوں میں اسکے تھے شاہنشاہ زمن
ناز پرور تو جہاں ہر گل رعنا رہا
شاہجہاں اس باغ کا برسوں چمن پیرا رہا

آبشاروں کی روانی اور نہروں کی جھلک — پانی پانی کیوں نہ ہوتے کوثر و تسنیم تک
گوہر شبنم کی زینت اور زر گل کی چمک — ہائے کیوں دیکھی گئی تجھ سے نہ اے چشم فلک
محو شالامار تھیں پریاں پرستاں چھوڑ کر
دیکھنے آتی تھیں حوریں باغ رضواں چھوڑ کر

آفریں صد آفریں اے ہمت شاہ جہاں — ہے زمانہ میں یہ تیری خوش نصیبی کا نشاں
یاد تازہ ہی تیری جبتک ہے نقش [illegible] — تیری عالی ہمتی ہے اس عمارت سے عیاں

ساتِ تختوں میں سجائی تو نے ایسی گل زمیں
آٹھ گلشن خلد کے ہوتے تھے جس سے شرمگیں

حشمت و شوکت تری اے خسروِ والا گہر
خطِ ریحاں میں لکھی ہے صفحۂ تاریخ پر
گرچہ تیری قوم ہے اب طائرِ بے بال و پر
دیکھتی ہو گی جہاں کے انقلابوں کو مگر

تھا ہمائے جلوہ تیرا جس جگہ سایہ فگن
اب وہاں رکھتے ہیں طرحِ آشیاں زاغ و زغن

آج اے بسمل وہ شیدائے قدامت ہیں کہاں؟
دیکھتے ہیں جو اس آئینے میں آثارِ جہاں
اس طرف بھی وہ سمندِ عزم کی پھیریں عناں
مٹ نہ جائے آہ نقشِ یادگارِ رفتگاں

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن اے ہوشیار
تا بماند نامِ نیکت تا قیامت برقرار

(از خان احمد حسین خانصاحب بی۔ اے پنشنر جج و ایڈیٹر شباب اردو۔ لاہور)

اے شالامار باغ یہ کیسی بہار ہے
گلگونۂ خزاں ترا باسی سنگھار ہے
ہر گل مثالِ غنچۂ سنگِ مزار ہے
ہر لالہ مثلِ داغِ دلِ بے قرار ہے

کیوں اُڑ رہی ہیں چہرۂ گل پر ہوائیاں
کیوں دے رہی ہے بلبلِ بیدل دوہائیاں
ہر پھول دم بخود ہے گریباں دریدہ ہے
فوارہ آبلے کی طرح آب دیدہ ہے
گلبانگِ مرغ نالۂ حلق بریدہ ہے
خوشبوئے باغ نکہتِ بادِ وزیدہ ہے

تو باغ پُر فضا ہے کہ حسرت نما ہے
جو تجھ کو دیکھتا ہے وہ ہوتا اداس ہے
بیمار ہے؟ مریض ہے؟ تو نیم جان ہے؟
کل لالہ رو تھا آج گلِ زعفران ہے
کل زمزمہ نوا و تو اب نوحہ خوان ہے
کیا تو ہی یادگارِ شہ شاہجہان ہے؟

سرتاج تاج حامیٔ اربابِ باکمال
آئیں جو پھر تو کیا کہیں؟ دنیا کی ہے زوال!
کھول آنکھ دیکھ چاک ہوا پردۂ ممات
اور پھر بہار آئی ہے ممتازِ نیک ذات
پھر زیبِ تن ہے نامِ خدا جامۂ حیات
اللہ کی شان آئی ہے گشتِ شان کی برات

طاؤس زرنگار اٹھائی ہوئی ہیں تخت
آزردہ مت ہو لینا ہے جو شالا باغ لے
او بے چراغ لے مری سینے کے داغ سے

اللہ میاں جو چاہیں تو یوں جاگتا ہے بخت
کیوں بد دماغ ہے مرا عالی دماغ سے
شبنم کو چھوڑ دیدۂ تر کا ایاغ لے

دن رات تیرے واسطے آنسو بہاؤں گا
اور زیر آبشار چراغاں دکھاؤں گا

دیگر مقامات کے شالا مار باغ

عام خیال یہ تھا۔ کہ شالا مار باغ کشمیر میں ہے یا لاہور میں۔ ان کے سوا ہندوستان میں اس نام کا اور کوئی باغ نہیں ہے۔ ایک باغ البتہ اس نام کا کابل میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن کسی کتاب اور کسی تاریخ میں "شالا مار باغ کابل" کا کچھ تذکرہ نہیں دیکھا۔ البتہ "باغ بابر" کا ذکر اکثر کتابوں میں آیا ہے۔ ظفر خاں احسن نے جو جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں کابل و کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ کابل و کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی "بے نظیر" کے نام سے لکھی ہے۔ اگر کابل میں شالا مار باغ کا وجود ہوتا۔ تو وہ کابل کے دیگر باغات کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی کرتا۔ لیکن اس نے اپنی مثنوی میں کابل کے شالا مار باغ کا کہیں نام بھی نہیں لیا۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں کشمیر کے شالا مار اور نشاط باغ کی تعریف میں وہ مستانہ وار جھومتا نظر آتا ہے۔

لاہور کے شالا مار باغ سے پہلے اس نام کا صرف ایک باغ کشمیر میں تعمیر کیا گیا تھا۔ باقی تمام باغات جو پنجاب اور ہندوستان کے دیگر مقامات میں شالا مار باغ کے نام پر ہیں سب لاہور کے شالا مار کے بعد بنائے گئے ہیں۔ اور بعض تو ان میں سے ابھی حال ہی کے ہیں۔ ان باغات کے کچھ حالات یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کے نام شالامار ہیں۔ اور جن کا سلسلہ کشمیر جنت نظیر کی پُر فضا وادی سے لے کر دہلی کی دیواروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جن میں سے اکثر کے دیکھنے کا مصنف اوراق ہذا کو بھی اتفاق ہوا ہے۔ یہ باغات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) کشمیر کا شالامار باغ جس کی تقلید میں شالامار باغ لاہور تعمیر کیا گیا۔

۲۔ شالامار باغ سوہدرہ (واقعہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ)

۳۔ باؤلی قلعہ دہلی کا شالامار باغ۔

۴۔ شالامار باغ راجوری (قلمرو جموں)

۵۔ جموں کا شالامار باغ۔

۶۔ شالامار باغ کپور تھلہ

۷۔ شالامار باغ واقعہ ریاست پٹیالہ متصل کالکا۔

سوائے باغ ۲ و ۳ و ۷ کے باقی تمام باغات راقم الحروف کے دیکھے ہوئے ہیں ممکن ہے ان کے علاوہ کوئی اور باغ بھی کسی اور مقام پر اس نام کا ہو جسکی کیفیت سے یہ ہیچمدان لاعلم ہو۔ اس لئے انہی باغات کے مختصر سے حالات ناظرین اوراق ہذا کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

شالامار باغ کشمیر

ہاروَن کی جھیل شہر سری نگر سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک خوشنما فرحت افزا اور روح پرور مقام ہاروَن[ملہ] کے نام سے واقع ہے۔ اگر خشکی کے رستے اس مقام پر جائیں تو گپکار چشمہ شاہی، نشاط اور شالامار سب اس کے رستے میں آتے ہیں۔ اس مقام پر دوسری صدی بکرمی میں ایک مشہور عابد مرتاض سو کرام سوامی رہتے تھے۔ انہوں نے اس شہر خاموشاں میں جس کی خاموشی و بے زبانی میں اسرار قدرت کے ہزار ہا نکات و رموز پوشیدہ ہیں اور جس کے سناٹے اور ہُو کے عالم پر لاکھوں ہنگامے قربان کئے جا سکتے ہیں۔ یاد الٰہی کے لئے ایک رَین بسیرا بنا رکھا تھا۔ راجہ پرورسین[ملہ] اس زمانہ میں کشمیر کا راجہ تھا۔ اُس نے کوہ ماران (ہری پربت) کے دامن میں فتوحات ملکی سے فارغ ہونے کے دس سال بعد سری نگر کے نام سے ایک شہر آباد کیا جو آج بھی اپنی رونق و آبادی اور وسعت میں بڑے بڑے شہروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ راجہ پرورسین اس مرتاض یوگی کی زیارت کے لئے ہاروَن کے مقام پر اکثر جایا کرتا تھا۔ یہ مقام نہ صرف اس لحاظ سے کہ یہاں ایک بزرگ و خدا رسیدہ عابد کا مسکن ہے اُسے پسند تھا بلکہ جھیل ہاروَن کے آئینہ صفت پانی کی لہریں جن کو قدرتی چشمے اور بھی دلآویز بنا رہے تھے۔ یہاں کی سطح ناہموار جگہ خصوصاً بے روک ہوا کے بے باک جھونکے جو بے پئے مست و سرشار کر دیتے ہیں۔ ہاروَن کی جھیل اس کے گھنے جنگل کا نظارہ، سبزہ زار

ملہ اگر شیخ نیاز محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور کی نظم بعنوان ہاروَن ملاحظہ کی جائے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں سیر ہاروَن کے بعد سری نگر میں لکھی ہے تو ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہاروَن کیسا دلفریب اور کس قدر دلکش مقام ہے۔ اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک چیز عام لوگوں کی نظر میں کیسی معمولی ہے اور ایک شاعر کی نگاہ اس کو کس نظر سے دیکھتی اور اس کی کیفیت سے کس قسم کے دل ہلا دینے والے نتائج پیدا کرتی ہے۔

ملہ ایام حکومت ۶۰ سال سنہ ۱۵۹ بکرمی لغایت سنہ ۲۱۹ بکرمی مطابق سنہ ۱۰۲ء لغایت سنہ ۱۶۲ء۔

کی کیفیتیں یہ سب باتیں دامنِ دل کھینچنے کے لئے کافی اثر رکھتی تھیں۔

شالی مالی کی بنا

یہ دلچسپیاں تھیں یہ وجوہات تھیں جن سے متاثر ہو کر راجہ پرورسین نے اپنے لئے وہاں ایک آرامگاہ تعمیر کرائی۔ جسے آجکل کے الفاظ میں ریسٹ ہوس REST HOUSE کہہ سکتے ہیں۔ راجہ کی تقلید میں امراء وزراء نے بھی بنگلے تعمیر کرائے۔ ان کے پرائیویٹ ملازموں کے لئے بھی مکانات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ مکانات ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئے۔ پرورسین نے اپنی شاہی اقامت گاہ کا نام شالی مالی رکھا۔

شالی مالی کی وجہ تسمیہ

اس مقام یا راجہ کی اقامت گاہ کا نام شالی مالی کیوں رکھا گیا۔ شالی مالی کا مطلب کیا ہے۔ اس کے متعلق جو زیادہ قرینِ قیاس وجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہم اپنے محقق و معتمد و مورخ دوست جناب شمیم کاشمیری[1] کے الفاظ ہی میں بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں آپ فرماتے ہیں "اثنائے مطالعہ میں ایک پوران میں جس کا نام اگنی پوران ہے ہمیں ایک پھول کا نام نگاہ سے گذرا جس کا نام "شالی مالی" ہے۔ تخیل نے ہمیں بتایا۔ کہ کسی گلستاں کا نام اس پھول سے پڑ سکتا ہے جو کثرت سے اس میں موجود ہو۔ شاید راجہ پرورسین نے اس مقام کا نام اس وجہ سے شالی مالی رکھا ہو۔ کہ شالی مالی پھول جو دیوتاؤں کو چڑھائے جاتے ہیں اس علاقہ میں اُس زمانہ میں زیادہ ہوتے ہوں یا خود راجہ ہی نے ان پھولوں کی افزونیِ پیداوار کا یہاں خاص انتظام کیا ہو۔"

کشمیر میں اُس زمانہ میں خالص سنسکرت زبان تھی۔ پوران بھی سنسکرت زبان ہی میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شالی مالی بھی اسی زبان کا لفظ ہے۔

شالی مالی اور اس کی عمارات کی ویرانی

پرورسین کی شصت سالہ حکومت اور رشی سوگرام سوامی کی حیات تک تو شالی مالی میں بڑی رونق رہی۔ اس زمانہ میں آجکل کی طرح خشکی کا رستہ نہیں تھا۔ شالی مالی تک آمد و رفت ان بے پہیہ فٹنوں اور لکڑی کے اُن اُڑن کھٹولوں کے ذریعہ ہوتی تھی جو آبِ ڈل کی سطح پر کشتیوں کے نام سے دوڑتے اور اُڑتے پھرتے تھے۔

---

[1] رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب رینہ شمیم ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب (لاہور)، جن کا پایۂ تحقیق بہت بلند ہے۔

راجہ کی وفات (سنہ ۱۶۲ء) کے بعد انقلاب روزگار نے رفتہ رفتہ شاہی آرامگاہ اور شاہی متوسلین کی سنگین و سربفلک عمارتوں کو بے نام و نشان کر دیا۔ وہ ایوانات جہاں راجے اور وزراء امراء رہتے تھے بُوم و چغد کی اقامت گاہ بن گئے۔ البتہ مٹتے ہوؤں کی ایک یادگار باقی رہ گئی +

شالی مالی سے شالی مار کس طرح بنا

راجہ پرورسین کی وفات (سنہ ۱۶۲ء) سے لیکر ہندو قدیم راجگان کے آخری ایام سنہ ۱۳۲۴ء یا ساڑھے گیارہ سو سال تک بڑے بڑے نامور راجے کشمیر میں گزرے ہیں۔ پھر سنہ ۱۳۲۵ء سے سنہ ۱۵۵۴ء تک کشمیر کے مسلمان بادشاہوں نے بھی کشمیر میں شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کی ہے۔

لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ کسی راجہ اور کسی بادشاہ نے چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں شالی مالی کے پُرفضا مقام کی طرف مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ سنہ ۱۵۵۶ء میں جب اقبال اکبری جنت کشمیر کیطرف رُخ کرتا ہے تو اس مقام کا نام پھر کشمیر کی تاریخوں میں نظر سے گذرتا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں اب یہ نام شالی مالی کی جگہ شالی مار مشہور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنسکرت کی آغوش میں ایک اور زبان کشمیری پرورش پا کر پروان چڑھتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ سارے ملک پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسی زبان نے شالی مالی کو شالی مار بنا دیا۔ مار کے معنے کشمیری زبان میں ندی یا نالہ ہیں۔ اور چونکہ ہاروَن کے مقام پر داچھی گام کے دامن میں ایک خوشنما جھیل بھی ہے۔ اس لئے اس کا نام شالی مار بالکل موزون معلوم ہوتا ہے +

باغ شالی مار اور شہنشاہِ اکبر

شہنشاہِ اکبر[1] کے زمانہ میں اُس مقام کا نام شالی مار تھا۔ وہ موسم بہار میں اس رُوح افزا مقام پر آیا اور اس کے ملاحظہ سے ایسا خوش ہوا کہ اُس کی جدت پسند طبیعت نے مناظر قدرت کی دلفریبیوں کو انسانی

---

[1] اکبر تین مرتبہ کشمیر میں آیا ہے۔ پہلی بار سنہ ۹۹۷ھ میں دوسری بار سنہ ۹۹۸ھ میں تیسری مرتبہ سنہ ۱۰۰۵ھ میں کشمیر سنہ ۹۹۴ھ ۱۶ ذیقعدہ کو اس نے فتح کیا تھا۔ سنہ ۱۰۱۴ھ کو اکبر نے وفات پائی +

دماغ کے اختراعات کے اشتراک سے اور زیادہ مزین کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تالاب ہاروَن سے ایک نہر نکالی جائے اور آبِ ڈل کے کنارے پر ایک باغ اسی مقام (شالی مار) کے نام پر احداث کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی چشمہ یعنی تالاب کے وسط سے ایک نہر جس کو جوئے کلان کہتے تھے جاری کی گئی۔ اور پہاڑ کے دامن میں جہاں ڈل کا پانی ختم ہوتا تھا بلند جگہ پر باغ شالی مار کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لب التواریخ[1] میں لکھا ہے "جوئے کلان در وسط آں رواں کردہ۔ عمارات عالیہ سنگین و صفّے و حوض سنگین قریب پنجاہ و پنجاہ بیش و پس عمارت با فوارہ کردہ ہمین و بسیار جوئے صفہائے خوشنما!" پھر یہاں کے ثمردار درختوں اور گل و گلزار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: "در زیر آں سبزہ سہ برگہ کہ بغایت نرم و خوشبو دارے باشد درمیانِ گلستان خیابان ہا برائے گلگشت تماشائیاں بستہ در ہر خیابان از دو جانب نہرے نہرے رواں ساختہ الحال بہ سبب عدم پرداخت آں طریق نماندہ لیکن نشانہا باقی است"۔ اس پہاڑی کا تعلق جس کے نشیب میں قریۂ شالیمار اور باغ شالیمار واقع ہے، پرگنہ پھاگ کے کوہستان کے ساتھ ہے۔ باغ کی چاردیواری اکبر کے زمانہ ہی میں بنائی گئی تھی۔

شالی مار میں جہانگیر کا باغ فرح بخش

جہانگیر زمانہ شاہزادگی میں تو بارہا کشمیر میں آیا ہے لیکن شہنشاہِ ہندوستان کی حیثیت سے وہ سب سے پہلی مرتبہ ۵ شوال ۱۰۲۸ھ کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ اور متھرا۔ دہلی۔ لاہور اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی سیر کرتا ۱۵ ربیع الاول ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۶۲۰ء کو یعنی کامل ۴½ ماہ کے بعد خطۂ کشمیر جنت نظیر میں پہنچا۔ جہاں ہمراہ اور شہزادے ساتھ تھے۔ شاہانہ طرز پر باغات و عمارات کی تعمیرات کا اہتمام ہونے لگا۔ شہزادہ خرم جو بعد میں شاہجہان ہو کر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا اپنے شوق طبعی کی وجہ سے اس جدید محکمہ کا مہتمم اعلیٰ قرار پایا۔

---

[1] یہ تواریخ اخوند ملا بہاؤالدین نقشبندی خوشنویس کاشمیری کی تصنیف ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ملا بہاؤالدین نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانہ میں وفات پائی ہے۔

جہانگیر نے قریۂ شالیمار میں اپنے والد شہنشاہ اکبر کی قائم کی ہوئی بنیادوں کو وسعت دی۔ اور شاہجہان نے اس میں نہایت رفعت و شوکت اور زیب و زینت کے ساتھ جا بجا عمارات تعمیر کر دیں۔ اس زمانہ میں دلاور خاں جس کی یادگار سری نگر میں اب بھی باغ دلاور خاں کے نام سے مشہور ہے کشمیر کا گورنر[1] تھا۔ شہنشاہ نے باغ کا نام "فرح بخش" تجویز کیا۔ مرزا محمد سلیم ایک درباری شاعر نے باغ کے تیار ہو جانے پر باغ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس کے شروع کے اشعار خصوصاً شعر (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی تعمیر سے پہلے اس مقام کا نام شالی مار ہی تھا۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں:

شنیدم شاہ روشن دل جہانگیر ۔۔۔ ز عشرت شد چو رونق بخش کشمیر
چو شد دامان دریا جلوہ گاہش ۔۔۔ بسوئے شالی مار افتاد راہش
فضائے دید چوں روئے عروساں ۔۔۔ سزاوار عمارات و گلستاں
بطبعش روح روح افزا اثر کرد ۔۔۔ گراں خوابی دماغش را خبر کرد

چو شد آراستہ باغ فرح بخش ۔۔۔ بحکم حضرت ظلِ الٰہی
شہنشاہِ شہاں شاہ جہانگیر ۔۔۔ کہ مشہور است از ماہ تا بماہی
پئے تاریخ ایں گلزار ریحانی ۔۔۔ خرد فرمود "فرحت گاہ شاہی" (۱۰۳۱ھ)

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ "فرحت گاہ شاہی" کا قطعہ تاریخ ذوالحجہ سنہ ۱۰۳۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ تو اس حساب سے یہ باغ دو سال دس ماہ کے عرصہ میں تیار ہوا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہانگیر وسط ربیع الاول سنہ ۱۰۲۹ھ میں کشمیر میں آیا ہے۔ اور اسی

---

[1] دلاور خاں سنہ ۱۶۱۸ء لغایت سنہ ۱۶۲۰ء مطابق سنہ ۱۰۲۷ھ لغایت سنہ ۱۰۲۹ھ تک کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ جہانگیر کشمیر سے واپسی کے وقت اس کو ساتھ ہی لے گیا تھا۔

[2] اس زمانہ (سنہ ۱۰۳۱ھ) میں کشمیر کا گورنر اعتقاد خاں تھا۔ جو سنہ ۱۰۳۱ھ سے سنہ ۱۰۴۳ھ تک کشمیر میں رہا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اس سے زیادہ طویل حکومت اور کسی گورنر نے یہاں نہیں کی۔

مہینے کے اندر اُس نے فرح بخش کی تعمیر کا حکم دیا ہے

شالامار باغ شاہجہان کے زمانہ میں | شاہجہان کو باغات و عمارات کا شوق باپ سے بھی زیادہ تھا۔ اکبرآباد۔ دہلی۔ لاہور۔ کشمیر اور ہندوستان کے بعض دیگر مشہور مقامات اب بھی تعمیرات شاہجہانی کی شہادتیں دے رہے ہیں۔ اس نے اپنے زمانہ میں باغ فرح بخش کو اور بھی وسعت دی۔ گل و گلزار۔ درختانِ ثمردار۔ فوارے۔ حوض۔ بارہ دری اور دیگر عمارات نے اس کو چار چاند لگا دیئے ؎

احسن اللہ احسن جس کو بادشاہ نے اسکی شجاعت و بسالت کی وجہ سے ظفر خاںؒ کا خطاب دیا تھا۔ ان دنوں کشمیر کا گورنر تہا۔ وہ خود مناظر فطرت اور قدرت کی گلکاریوں کا عاشق تہا۔ اور باغات و عمارات کی تعمیر میں شاہانہ دماغ رکھتا تہا۔ چنانچہ کشمیر میں اُس نے چار باغ بنوائے اور اپنی مشہور مثنوی میں ان کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے ظفر خاں کو فیض باغ کی تیاری اور فرح بخش کی آرائش کا حکم دیا جس کا ذکر وہ اپنی مثنوی میں بھی ذیل کے الفاظ میں لکھتا ہے :-

ظفر خاں کردہ از تعلیم حضرت ... ز فرط دانش و ادراک و فطرت

دو گلشن را بہم ز انگونہ پیوند ... کہ نتواں شاں جدا کردن بہ سوگند

در آوردہ چنیں رضواں سرشتے ... بہشتے را در آغوش بہشتے

فرح بخش آں سر ہر باغ و بستاں ... فرح بخش دماغ حور رضواں

بزیر پایش از دل مے نہد سیم ... بفرق از فیض بخشش زیب دیہیم

ہمیشہ تازہ است آں باغ دلخواہ ... شگفتہ چوں گلِ بخت شہنشاہ

خصالی شاعر نے باغ فیض بخش کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جس کے اخیر شعر سے سال تعمیر ۱۰۴۲ھ نکلتا ہے۔ اس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں ؎

چو باغ فیض بخش از حکم شاہی ... ابر باغ ارم گشتہ سپاہی

فرح بخش از کمالِ افتخارش ... چو گل بر طرف خود دادہ قرارش

ؒ ظفر خاں خواجہ ابوالحسن کا بیٹا تہا۔ شاہجہان نے دراصل ابوالحسن (باقی برصفحہ ۵۸)

ازیں رو کاشمر فخرِ جہاں است	کہ در وے گلشنِ شاہ جہان است
پئے تاریخِ سالش صبح گاہی	خرد گفتا "مسرت بخش شاہی"

شالی مار سے شالامار | جہانگیر کے زمانہ تک شالامار کو شالیمار ہی کہتے تھے۔ جیسا کہ مرزا محمد سلیم کے شعر ؎ چو شد داماں دریا جلوہ گاہش۔ لبوئے شالی مار افتاد راہش سے واضح ہوتا ہے۔ لیکن شاہجہان کے زمانہ میں شالی مار کی جگہ شالامار نام زبانزد عوام ہو چکا تھا۔ چنانچہ ظفر خاں احسن اپنی مثنوی میں لکھتا ہے ؎

بوصفِ شالامار آں خلد ثانی	نگہ ہر گوشہ در گوہر فشانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴) ہی کو گورنر کشمیر مقرر کیا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے نظامت کشمیر پر اپنے قابل و لائق بیٹے احسن اللہ کو مقرر کرا دیا۔ احسن اللہ شاعر تھا۔ صائب اور غنی کے ساتھ اس کی بزم آرائیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ شعراء کا قدردان بھی تھا۔ اور انعام و اکرام کے ذریعہ داد سخن دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ کشمیر میں ۱۰۴۲ھ سے ۱۰۵۱ھ اور دوسری مرتبہ ۱۰۵۲ھ سے ۱۰۵۶ھ تک رہا ہے۔ ۱۰۴۸ھ میں اس نے بادشاہ کے حکم سے تبت کو فتح کیا اور ظفر خاں کا خطاب حاصل کیا۔

اس کی مثنویاں ہفت منزل اور بے نظیر بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر راقم کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ اس نے اپنی مثنویوں میں لاہور۔ اکبر آباد۔ کابل اور کشمیر کی بہت تعریف کی ہے کشمیر سے تو عشق حقیقی رکھتا تھا۔ لکھتا ہے ؎

الٰہی تا بود کشمیر آباد	ز گلزارِ جہنم اسائم مدہ باد
بہر کس ہرچہ خواہد بے سخن دہ	مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

لاہور کے متعلق لکھتا ہے ؎

زبعد اکبر آباد است لاہور	کہ در خوبی بعالم گشتہ مشہور
بروں آرد ہوایش از فراقت	دہد یاد از خراسان و عراقت
بکام دل چو احسن ناتوانی	بہ باغ کامراں کن کامرانی

آج باغ کامران کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ بارہ دری کامران (بقیہ بر صفحہ ۵۶)

فرح بخشش شہنشہ نام کردہ — فرح زاں باغ جنت وام کردہ

پھر ایک جگہ لکھتا ہے

فلک زینگونہ کردہ تیز رخشش — کہ تا آید بطوف فیض بخشش
برآوردہ پر از شوق نگارشش — کہ تا بوسد کنار شالہ مارشش

پھر شالامار کی تعریف میں بے خود ہو کر کہتا ہے

نسیم از رنگ گلہاش ارغوانی — نزاکت کردہ بر شاخش گرانی
بروئے سبزہ شبنم گشتہ سیار — چو عکس گوشوارہ از خط یار
گلش دست صبا را رنگ کردہ — کہ بو بہ رنگ حنا ہا جنگ کردہ
سر زلف نہال او بہ منت — نگہ دارد دل مرغان جنت

شالامار میں شاہی عمارتوں سے کیا کچھ رونق تھی ، اس کی کچھ کیفیت اب بھی شالامار کشمیر کی عمارات سے معلوم ہو سکتی ہے ، مگر ظفر خاں جو اس زمانہ کا چشم دید گواہ ہے دیکھیے کن پر شکوہ الفاظ میں صناعید عجم کے نقش و نگار کا پتہ بتاتا ہے

عمارتش بہ نوعے دل نشین است — کہ گوئی خاتم جم را نگین است
بسقفش نقش بستہ اسم اعظم — نہ خاتم بند نقشش چوں نقش خاتم
نہ دیدہ چشم کس در دل ربائے — عمارا تے بہ ایں محکم بنائے
عمارا تے بہ ایں خوبی کہ دیدہ — ز سنگ و چوب عجوبی کہ دیدہ
ز شوق دیدن آں سقف و دیوار — دراں ثابت کواکب گشتہ سیار
ہوائے او چناں از نشہ سیراب — کہ ساقی نیست محتاج مئے ناب
چہ کیفیت چناں سقف و بنائش — کہ پر مے میشود جام از ہوائش
ز خوبی ماہ تا ماہی درو ہست — چہ جنت ہر چہ مے خواہی درو ہست
بہ ایں خوبی بہ چہرۂ بر زمین نیست — شبستانے چنیں در ہند و چین نیست

(بقیہ صفحہ ۱۵۵) کی سخت جانی زاوی کے کنارہ پر دریا کی موجوں کے تھپیڑوں کا سالہا سال سے مقابلہ کر رہی ہے ، اور گو انجام معلوم ہے لیکن صرف اتنا سہارا ہے ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا ؁

شالامار باغ عالمگیر کے زمانہ میں

جہانگیر اور شاہجہان تو کئی مرتبہ کشمیر آئے ہیں۔ مگر عالمگیر صرف ایک ہی مرتبہ اس جنت نظیر ملک میں آیا ہے اور واپس گیا ہے تو اس خیال کے ساتھ کہ "بدوں ضروری امور ملکی کے سرزمین کشمیر میں صرف سیر و شکار کے لئے بادشاہوں کا آنا رائے صائب کے خلاف ہے" اور اس رائے کے قائم کرنے کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ وہاں سفر میں کئی آدمی اور گھوڑے اور دیگر جانور ہو گئے۔ بلکہ ایک ہاتھی بھی پہاڑوں کے نشیب و فراز کی نذر ہو گیا۔

غرض بادشاہ ذی قعدہ سنہ ۱۰۷۵ھ میں بعہد اسلام خان گورنر کشمیر میں آیا۔ فوج لشکر حرم سرا ساتھ تھے۔ فرح بخش اور فیض بخش کی عالیشان عمارتوں میں پھر رونق نظر آنے لگی۔ بادشاہ نے عید کا جشن بھی اسی باغ میں منایا۔ اور آخر صفر کو تین ماہ کے قیام کے بعد واپس لاہور آ گیا۔

بادشاہ کے ساتھ ڈاکٹر برنیر مشہور سیاح بھی تھا جس نے اپنے سفرنامہ میں اس باغ کے نہایت دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

افغانوں کا دور

مغل شہنشاہوں کا عروج عالمگیر کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی مغل بادشاہ کشمیر کیا لاہور[1] تک بھی نہیں آسکا۔ زوال سلطنت کے بعد پنجاب کشمیر اور کابل کے صوبے درانیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ جن میں پنجاب تو سنہ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لے لیا۔ اور کشمیر اور کابل پر افغانوں ہی کا قبضہ رہا۔ سنہ ۱۸۱۹ء میں کشمیر بھی افغانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

محمود شاہ و شجاع الملک درانی کے عہد میں سردار محمد عظیم خان سنہ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۱۹ء تک کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ سردار مذکور شالامار کے دونوں حصّوں فیض بخش اور فرح بخش میں داد عشرت دیتا رہا ہے۔ اس نے باغات کی مرمت بھی کرائی۔ اور حتی الامکان اسکی آرائش

[1] صرف عالمگیر کا بیٹا شاہ عالم بہادر شاہ اول لاہور تک آیا ہے۔ بلکہ اس نے وفات بھی لاہور ہی میں پائی ہے۔ اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ بہ ایام شہزادگی احمد شاہ درانی کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے صرف سرہند تک آیا ہو۔ اور احمد شاہ کو لاہور میں بھگا کر آپ واپس دہلی چلا گیا ہے یہ آخری فتح تھی جو اکبر کے جانشینوں کو حاصل ہوئی تھی۔

و زیبائش اور رونق اور خوبصورتی کو کم نہ ہونے دیا۔

سکھوں کے عہد میں شالامار

سکھوں کے زمانہ میں جہاں پنجاب کی اسلامی عمارات پر زوال آیا۔ کشمیر کی اسلامی عمارتیں بھی ان کے مذہبی تعصب سے نہ بچ سکیں۔ دیوان کرپارام جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کا چھٹا گورنر کشمیر تھا کے عہد (۱۸۲۷ء لغایت ۱۸۳۱ء) میں شالامار باغ کی حالت بہت ردی تھی۔ حالانکہ اس سے تیرہ چودہ سال پیشتر ہی افغانی دور میں اس کی مرمت از سرنو ہو چکی تھی۔ دیوان چونکہ باغات و اختراعات کا بڑا شوقین اور نہایت زندہ دل بلکہ عیش پرست امیر تھا۔ اس لئے اس نے تین ہزار روپیہ شالامار کی مرمت کے لئے خزانہ سے منظور کئے۔ مگر مرمت کا کام ایسے نااہلوں کے ہاتھ میں رہا کہ یہ کام سرانجام نہ ہو سکا۔

شالامار اور ڈوگرہ حکومت

۱۸۴۶ء میں کشمیر کے تخت و بخت کے ساتھ ہی شالامار کشمیر کی قسمت بھی ڈوگرہ خاندان کے قبضہ میں آگئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ آنجہانی کے ایام حکومت (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) میں وزیر پنوں کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے ۱۸۶۳ء میں نشاط باغ وغیرہ کے علاوہ مہاراجہ کے حکم سے شالامار کی مرمت بھی شروع کی۔ مگر نگران کاروں کی بددیانتی کے باعث مرمت کی بجائے باغ کو دانستہ برباد و تباہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ محمد خلیل مرجانپوری نے اپنی کتاب تاریخ خلیل میں لکھا ہے کہ "نو دانہائے نحاس از میاں کشیدہ بردند بجائے آں ناؤ دانہائے سفالین چسپانیدند۔ نگین ہائے عقیق وغیرہ بمقدار دو تحرہ وار زر بقبضہ آوردند۔ ایں ہمہ بموجب غور و بروا اہل کاراں شد"۔

موجودہ حکمران کشمیر مہاراجہ پرتاب سنگھ کی طرف سے جن کے عہد حکومت کو ۱۹۲۴ء میں ۱۸۸۵ء کی تخت نشینی کے مطابق چالیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ شالامار باغ کی کئی مرتبہ مرمت ہو چکی ہے۔ خصوصاً جب کبھی وسیرایان ہند کشمیر میں بغرض سیر و سیاحت آتے ہیں۔ یا مہارانی صاحبہ خود مہاراجہ صاحب یا سر راجہ ہری سنگھ کوئی پارٹی شالامار باغ میں دینا چاہتے ہیں تو اس کی درستی، مرمت، صفائی اور تراش خراش کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں سر راجہ ہری سنگھ ولی عہد کی سالگرہ کی تقریب پر شالامار میں ایک پارٹی اعلیٰ پیمانہ پر دی گئی تھی۔

جس میں ہز ہائی نس تمام امراء، وزراء صاحب ریذیڈنٹ اور انگریز معہ لیڈیوں کے جمع تھے۔ اور ۷، ۱۱، اکتوبر کو والسرائے لارڈ ریڈنگ کی دعوت شاہی اور ۱۲، ۱۴، اکتوبر کو مہارانی صاحبہ اور لیڈی ریڈنگ کی زنانہ ٹی پارٹی کے موقعہ پر باغ کا جوبن قدرتی نظاروں اور انسانی دستکاریوں کی نمود و نمائش کی وجہ سے پھٹا پڑتا تھا۔

شالامار باغ سوہدرہ

سوہدرہ بہت پرانا قصبہ ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ محمود غزنوی کے غلام ایاز کا آباد کیا ہوا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں یہ پرگنہ سیالکوٹ کے ماتحت تھا۔ اور نہایت آباد و بارونق تھا۔ اب ضلع گوجرانوالہ میں تحصیل وزیر آباد کے ماتحت ہے۔

خلاصۃ التواریخ[1] میں لکھا ہے کہ امیر الامراء نواب علی مردان خان کو شاہجہان نے جب پنجاب کی نظامت سپرد کی۔ تو اُس نے سوہدرہ کا نام اپنے بیٹے کے نام پر ابراہیم آباد رکھا۔ اور اس کو عالیشان ایوانات سے دار الخلافہ (لاہور) کا ہم پلہ بنا دیا۔ ایک بے نظیر باغ تعمیر کرایا جس کا صحیح نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن سوہدرہ کا باغ چونکہ باغ لاہور کے نمونہ پر تھا۔ اسی طرح مختلف طبقے۔ فوارے۔ نہریں حوض آبشاریں اس کے اندر تھیں اس لئے وہ شالامار باغ ہی کے نام سے موسوم ہو گیا۔

شالامار لاہور ۱۰۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اور ۱۰۶۷ھ میں نواب علیمردان خان کا لاہور ہی میں انتقال ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوہدرہ کا باغ جس کی متعلق صاحب خلاصۃ التواریخ لکھتے ہیں "دم مساوات بہ باغ شالامار مے زند" ۱۰۵۲ھ سے ۱۰۶۷ھ کے درمیان ہی تعمیر ہوا ہے۔

---

[1] صفحہ ۴۲، مطبوعہ ۱۹۱۸ء سال تصنیف ۱۱۱۵ھ عہد عالمگیری۔ یہ تاریخ بہت نایاب تھی مگر ۱۹۱۸ء میں طبع ہو کر عام ہو چکی ہے۔

باغ لاہور کی تعمیر پر چھ لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔ باغ سودہرہ کی لاگت
بھی اس سے کم نہ تھی۔ تاریخ مذکور میں لکھا ہے "شش لکھ روپیہ براں عمارت عالیہ
و باغ و نہرے کہ از دریائے توی برائے باغ آوردہ صرف شدہ ووہے از دیہات سودہرہ
از سرکار بادشاہی برائے مرمتِ باغ و شہر مذکور بطریق انعام التمغا بنام امیر الامراء
مقرر راست"

جس باغ پر اُس زمانہ میں جبکہ معمار و مزدور کی اُجرت تین چار آنہ سے زیادہ نہ تھی
اور جس کے لئے طویل طویل فاصلہ سے نہر جاری کی گئی ہو۔ جس کے اندر عالیشان
و رفیع درجات عمارتیں تعمیر ہوئی ہوں۔ اور جن کی شکست ریخت اور مرمت کے لئے
حکومت کی طرف سے بعض دیہات معاف ہوں۔ وہ باغ کس شان و شکوہ اور کس
جاہ و جلال کا ہوگا۔

ابراہیم خاں جس کے نام پر علی مردان خاں نے سودہرہ کا نام ابراہیم آباد رکھا
بعہد عالمگیری ۱۰۷۲ھ میں پہلی مرتبہ کشمیر کا گورنر مقرر ہوا۔ اسی کے عہد میں عالمگیر
تین ماہ تک کشمیر میں رہا ہے۔ دوسری مرتبہ ابراہیم خان کو ۱۰۸۹ھ میں پھر کشمیر کی
نظامت پر بھیجا گیا۔ جہاں وہ ۱۰۹۶ھ تک رہا۔ تیسری مرتبہ ۱۱۱۳ھ سے ۱۱۱۷ھ تک
کشمیر کا صوبہ رہا۔ چوتھی بار یعنی آخری مرتبہ وہ ۱۱۲۱ھ میں پھر کشمیر آیا۔ اسی سال
عالمگیر نے اس کو نواب علی مردان خان ثانی کا خطاب دیا۔ لیکن ابراہیم ضعیف ہو چکا
تھا۔ تین ماہ کے بعد اس نے کشمیر ہی میں انتقال کیا۔

اس کی زندگی (۱۱۲۱ھ) تک باغ اپنے پورے شباب پر تھا چنانچہ ۱۱۱۸ھ
کا مصنف (صاحب خلاصۃ التواریخ) باغ سودہرہ کی تعریف میں اکثر مقامات پر رطب
اللسان نظر آتا ہے۔ لیکن آج سوا دو سو سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں۔ تو کھنڈرات
اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان سے صرف اس قدر بتا سکتے ہیں

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

سودہرہ میں اس علاقہ کا نام جہاں یہ باغ تھا۔ نولکھا باغ مشہور ہے۔ اور کہا

جاتا ہے کہ یہ باغ نو لاکھ روپیہ کی لاگت سے بنا تھا۔ لیکن خلاصۃ التواریخ کا مصنف جس نے خود وہ باغ دیکھا ہے۔ نہ اس نام (نولکھا) کی تصدیق کرتا ہے اور نہ اس لاگت (نو لاکھ) کی۔ باغ کی زمین کچھ ہندوؤں کے قبضے میں ہے کچھ مسلمان زمینداروں کے پاس ہے۔ باغ کی عمارتوں بلکہ چاردیواری اور بنیادوں تک کی اینٹوں سے لوگوں نے اپنے اپنے مکانات بنالئے۔ اور کیوں نہ بنتے ؎

آخر گل اپنی صرف در میکدہ ہوئی　　پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

باغ شالمار باؤلی قلعہ دہلی

شاہجہان کا چوبیسواں سال جلوس تھا کہ سنہ ۱۰۶۱ھ مطابق سنہ ۱۶۵۰ء میں اُس کے اکبر آبادی محل نے قلعہ شاہجہان آباد سے اڑہائی کوس کے فاصلہ پر باؤلی کے قریب ایک عالیشان باغ لاہور[1] اور کشمیر کے سرکاری باغات کے نمونوں پر تعمیر کرایا جس کے طبقوں اور تختوں کے نام بھی انہی کے ناموں پر فرح بخش اور فیض بخش رکھے گئے اس باغ کے اندر لاہور کی طرح خوشنما عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ نہر نہ صرف باغ کو سیراب کرتی تھی۔ بلکہ تمام عمارتوں کے نیچے دو گز چوڑی بہتی تھی۔ یہ چوڑائی باغ کے عین وسط میں آٹھ گز ہو جاتی تھی۔ یہ باغ اور اس کی عمارتیں تین چار سال کے عرصہ میں دو لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوئیں۔

باؤلی میں ایک سرائے بھی تھی جو پہلے خام تھی۔ مگر جب باغ کی تعمیرات شروع ہوئیں۔ تو اس کے ایوان اور حجرے جو تعداد میں ستر تھے۔ ریختہ کے بنوا دیئے گئے۔

---

[1] ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۴۲۷ ایڈیشن اول۔

شالامار باغ راجوری (قلمرو جموں)

کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ کی شہرت ہندوستان کے ہر حصہ میں پہونچ رہی تھی اُس زمانہ کے شوقین رؤساء نے بھی اس نمونہ پر باغات تعمیر کرائے۔ ان میں ایک باغ راجہ عنایت اللہ خاں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی عہد میں اپنے دارالخلافہ راجوری میں تعمیر کرایا۔ اُس زمانہ میں راجوری کا نام راجور تھا۔

راجہ عنایت اللہ خاں ۱۰۵۸ھ میں بعہد شاہجہان تخت نشین ہوا۔ دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ پنج ہزاری منصب رکھتا تھا۔ اور اس کے معاوضہ میں پنجاب سے کشمیر تک کے رستہ کی حفاظت کے فرائض اس کے ذمہ تھے۔ مرزا رفیع اللہ خاں اس کے بیٹے نے راجہ دھرپ دیو پر جموں میں فتح پائی تھی۔ اور بطور یادگار منڈی یعنی شاہی محلات کی چند اینٹیں اکھڑ کر اپنے ہمراہ راجور میں لے آیا تھا۔

راجہ عنایت اللہ خان نے عالمگیر اور دارا کی لڑائیوں میں ہمیشہ اول الذکر کا ساتھ دیا۔ اس لئے جب عالمگیر بادشاہ ہوا۔ تو اُس نے خلعت بے بہا ہفت زنجیر فیل اور کئی گھوڑوں اور قیمتی اسباب کے علاوہ پونچھ۔ سابلہ۔ مناور۔ گری گڑہ بالی۔ بھمبر۔ چھبال کے علاقے بطور جاگیر عطا فرمائے۔

۱۰۶۸ھ کے بعد جب ریاست راجور ایک مملکت ہوگئی۔ تو راجہ عنایت اللہ خان نے خاص شہر میں کچہری محل۔ حمام اور جامع کی عالیشان عمارتیں اور مختلف مقامات میں قلعہ جات بنوانے کے علاوہ دریا کے پار شالامار باغ کے نام پر ایک باغ تیار کرایا۔ اس میں ایک خوشنما بارہ دری بنوائی۔ باغ کی ایک طرف کی دیواریں دریا کے پانی سے ٹکراتی تھیں۔ چاردیواری باغ کی بڑی مضبوط تھی۔ اور چاردیواری کے اندر علاوہ بارہ دری کے اور بھی کئی مکانات تھے۔

۱؎ وفات بعہد عالمگیر ۱۰۸۲ھ

شالامار اور دیگر عمارات کی تکمیل کے بعد اس باغ میں اعلیٰ پیمانہ پر چراغاں اور روشنی کا انتظام کیا گیا۔ روشنی کی شعاعیں جب دریا کے بہتے ہوئے پانی پر اپنا عکس ڈالتی تھیں تو اُن کی لرزتی اور کانپتی ہوئی ترچھی لکیریں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ اس عظیم الشان جلسہ میں جو اس کوہستان میں اپنی قسم کا پہلا جلسہ تھا۔ رعایا کو دعوت عام دی گئی۔ کاریگروں اور میر عمارات اور منتظموں کو انعامات اور خلعت تقسیم کئے گئے ۔

راقم الحروف نے بھی یہ باغ ۱۹۰۳ء میں گجرات اور بھمبر کے رستے کشمیر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ بارہ دری موجود ہے جس سے اب ڈاک بنگلہ کا کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کی مرمت وغیرہ ہوتی رہتی ہے۔ چار دیواری کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ صرف وہ دیوار موجود ہے جس کے ساتھ موسم برسات میں دریا زور شور کے ساتھ بہتا ہے۔

۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ والئی جموں کو اس کی ظاہری و باطنی خدمات کے صلہ اور انگریزوں کو ایک کروڑ روپیہ دینے کے معاوضہ میں مہاراجہ کا خطاب اور کشمیر اور کوہستان ہزارہ کا علاقہ دیا گیا۔ چنانچہ اسی بناء پر اس نے ۲۲ رمئی ۱۸۴۶ء کو ریاست راجور پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانہ میں راجہ رحیم اللہ خاں وہاں با اختیار رئیس تھا۔

وزیر آباد میں راجگانِ راجور کی جو شاخ مقیم ہے۔ وہ راجہ رحیم اللہ خاں کے بیٹے راجہ فقیر اللہ خاں کی اولاد سے ہے۔ اس شاخ کے سرکردہ اس وقت راجہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ہیں۔ جو نہ صرف اپنے شہر اور ضلع کے بلکہ صوبۂ پنجاب کے نامور رئیس ہیں۔ اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں ۔

شالامار باغ جموں

موجودہ ملک معظم جارج پنجم کے والد ماجد ایڈورڈ ہفتم آنجہانی شاہ انگلستان و شہنشاہ ہندوستان جب اپنی والدہ ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی زندگی میں بعالم شہزادگی ۱۸۷۵ء مطابق سمت ۱۹۳۲ب میں سیاحت ہند کے دوران میں جموں تشریف لائے تھے۔ تو مہاراجہ رنبیر سنگھ والئی جموں و کشمیر نے ان کی یادگار میں بمقام جموں عجائب گھر اور یہ باغ شالامار باغ کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ یہ دونوں عمارتیں سمت ۱۹۳۳ب میں مکمل ہو گئی تھیں۔ جہاں باغ واقعہ ہے۔ وہاں جنگل تھا اور جگہ نہایت نشیب و فراز تھی۔ چبوترہ کسٹم سے منڈی (شاہی محلات) کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ شالامار باغ نظر آتا ہے۔ باغ کے دروازے کے آگے بہت سی فراخ جگہ تھی۔ جہاں انجمن اسلامیہ اور آریہ سماج کے سالانہ جلسے بڑے بارونق ہوتے تھے۔ اور عیدین کا میلہ بھی لگتا تھا۔ مگر ۱۹۲۱ء میں یہ سفید جگہ دیوان بشن داس سابق چیف منسٹر نے اپنے عروج کے ایام میں حاصل کر لی۔ اور یہاں مکانات تعمیر کر لئے۔ اب باغ بالکل بے رونق ہو گیا ہے۔ باغ کا کل رقبہ تیس بیگہ کے قریب ہے۔ بیس ہزار روپیہ اس پر لاگت آئی تھی۔ اس کی چاردیواری گول پتھروں سے غیر معمولی طریق پر بنائی گئی ہے۔ باغ کے اندر کچھ مکانات بھی ہیں۔ درخت ثمردار ہیں۔ جن میں پیوندی آم خصوصاً قابل تعریف ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ جو باغ کے بانی تھے وہ اکثر اس باغ میں آمدورفت رکھتے تھے۔ مگر موجودہ والئی ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ سالہا سال سے اس باغ میں نہیں آئے۔ اور اب تو دیوان صاحب کے مکانات نے باغ کی رہی سہی رونق پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔ اس لئے باغ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

شالامار باغ کپورتھلہ

راجہ فتح سنگھ والئے کپورتھلہ نے ۱۸۱۱ء میں کپورتھلہ کے گوشہ شمال مغرب میں تفریح طبع اور کپورتھلہ کی رونق و زیبائش کے لئے یہ باغ تعمیر کرایا۔ باغ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک ندی جس کو نالہ باہئین کہتے ہیں جاری ہے۔ اس ندی سے ایک نہر نکالی گئی ہے۔ جو شالامار باغ کے پیچھے غرب کی طرف بہتی ہوئی پھر باہئین میں جاملتی ہے۔ اس باغ میں راجہ فتح سنگھ نے گو لاہور کے شالامار باغ کیطرح طبقے تو قائم نہیں کئے۔ لیکن باغ کے اندر عمارات عمدہ تیار کرائیں جن سے باغ کی رونق دوبالا ہو گئی۔ باغ کی بیرونی فصیل یعنی چار دیواری نہایت پختہ اور شاندار بنی ہوئی ہے۔ باغ کے دو دروازے ہیں۔ ایک جنوب کی طرف برلب سڑک۔ دوسرا شمال کیطرف۔ باغ کے اندر ایک عظیم الشان چاہ ہے جس کو آسمانی کنواں کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کنوئیں ہیں۔ اور واٹر ورکس انجن بھی ہے +

بارہ دری کی عمارت قابل دید اور دلکش ہے۔ باغ کے اندر ایک پرائمری سکول اور ایک سرکاری لائبریری ہے۔ باغ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ جگہ جگہ آرام کے لئے بنچیں رکھی ہوئی ہیں ہری ہری گھاس سے باغ کی کیفیت دلوں پر خاص اثر کرتی ہے۔ سنگ مرمر کا ایک خوبصورت تالاب بھی اس باغ میں ہے۔ لیکن اب وہ عرصہ سے بند ہے۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی خوبصورت سمادھ کے اعلے قسم کے سُرخ پتھروں کی وجہ سے بھی باغ میں رونق رہتی ہے +

بسنت کا میلہ کپورتھلہ میں اسی باغ میں ہوتا ہے۔ طوائف۔ نقال۔ قوال گانے والے اور مختلف قسم کے دوکاندار اور شوقین لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ اور والئے ریاست کی طرف سے مستوفین کو انعام و اکرام ملتا ہے +

باغ میں کھٹا۔ میٹھا۔ انار۔ آم۔ جامن۔ کیلہ۔ امرود وغیرہ کے بے شمار درخت خوبصورت

اور صاف روشوں کے اندر موجود ہیں :-

موجودہ والئی ریاست مہاراجہ جگت جیت سنگھ بہادر باغ کی سیر کو اکثر تشریف لایا کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود باغ کی پررونق میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی :-

جب فروری ۱۹۲۳ء میں مہاراجہ صاحب کی دختر مہاراجکماری امرت کور صاحبہ کی شادی راجہ جوگندر سین والئی ریاست منڈی کے ساتھ ہوئی۔ تو ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو شالا مار باغ میں ایک عظیم میلہ منعقد کیا گیا۔ کہتے ہیں شالا مار باغ کیا کپور تھلہ میں ایسا اژدہام پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مہاراجہ صاحب ٹکہ صاحب مہاراجکمار صاحبان راجہ صاحب منڈی کے علاوہ وزیر اعظم دیوان عبد الحمید۔ جملہ اہلکاران ادنےٰ و اعلےٰ معززین ریاست اور زمیداران علاقہ سب آئے تھے۔ رقص و سرود کے جلسوں اور دیگر قسم کے تماشوں سے وہ رونق تھی کہ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ اور باغ میں کہیں پاؤں رکھنے کو جگہ نہ تھی :-

باغ کے ساتھ جہاں ایک لیچس اور شہتوت کے درختوں کا ذخیرہ ہے وہاں پہلے دلدل تھی۔ سات سال ہوئے مہاراجہ جگت جیت سنگھ نے یہاں ذخیرہ لگایا جو قریباً ۱۲ ہزار مربع میل رقبہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ راجہ فتح سنگھ کے زمانہ میں باغ میں مثمن برج تھا۔ جہاں ہر وقت پہرہ رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا وہ ہشت پہلو برج گرا دیا گیا ہے :-

شالا مار باغ کالکا

کالکا شملہ ریلوے پر کالکا ریلوے سٹیشن کے متعلق یہ باغ ریاست پٹیالہ کے علاقہ میں واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ باغ بہت پرانا ہے اور بادشاہی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ لاہور کے شالا مار باغ کے برابر ہے۔ اور اسکے طبقے

اور نقشے بھی اسی طرح ہیں۔ جس طرح لاہور شالامار باغ کے ہیں۔ باغ کے اندر ریاست پٹیالہ کے سرکاری مکانات بھی ہیں۔ جن میں ریاست کے ملازم بود و باش رکھتے ہیں ÷ ایک باغ شجاع آباد ضلع ملتان میں بھی شاہ بہار جگاہ آباد کیا ہوا بتایا جاتا ہے

کوہستانِ کشتوار کا نالہ شالامار

ہندوستان پنجاب اور کشمیر کے باغات شالامار کا ذکر کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس شالامار کی کچھ کیفیت بھی بتا دی جائے۔ جس کے ساتھ باغ کے لفظ کی بجائے ندی کا لفظ مشہور چلا آتا ہے ÷

میں سنہ ۱۹۲۰ء میں ضلع اودھم پور (قلمرو جموں) کے بعض پُر فضا مقامات کی سیر و سیاحت میں تھا۔ ایک مقام پر مجھے ایک ندی کا نام شالامار بتایا گیا۔ جو کشتواڑ کے عظیم الشان پہاڑ ناگنا شیرو کی عین چوٹی سے نکلتی ہے۔ میں نے ہمراہیوں اور اردگرد کے زمینداروں سے اس ندی کے نام شالامار کے متعلق بہت کچھ استفسارات کئے۔ ندی کا نام شالامار کب سے ہے۔ کیا اس نام کا تو احاطہ ناگنا شیرو میں کوئی باغ ہی تھا؟ بصورت اثبات اس کو کس نے کس سنہ میں آباد کیا؟ ندی کو شالامار کیوں کہتے ہیں؟ لیکن کسی سوال کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ یہ نام اس قدر قدیم عرصہ سے ہے کہ اس علاقہ میں کوئی شخص اس کی صحیح تاریخ نہیں بتا سکتا۔ راقم الحروف کا اپنا خیال یہ ہے کہ جس زمانہ میں ندی کا نام شالامار رکھا گیا ہے۔ وہ قدیم ہندو راجگان کشمیر کا زمانہ تھا۔ اس لئے کہ شالا ہندی لفظ ہے جس کے معنے گھر یا جگہ یا مقام کے ہیں۔ اور مار کشمیری زبان کا لفظ ہے جس کے معنے ندی نالہ کے ہیں۔ علاقہ کشتواڑ میں گو ہندو راجاؤں کی اپنی حکومت رہی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ کشمیر کے قدیم ہندو راجگان کو ہمیشہ ان پر فوق رہا ہے۔ اور کشمیر کی زبردست ہمسایگت کی وجہ سے کشتواڑ کے راجوں کو عموماً ان کا زیر دست رہنا پڑا ہے۔ کشتواڑ اور بھدرواہ

کے علاقوں میں اب بھی بہت سے کشمیری موجود ہیں۔ اور ہر چند وہ سب قریباً مسلمان ہی ہیں۔ لیکن آخر یہ انہی لوگوں کی اولاد ہیں۔ جن کے بزرگوں نے آٹھویں صدی ہجری تک میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان سطور کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان علاقوں میں کشمیریت کے آثار جن کی یادگار یہ نالہ شالامار ہے اب بھی پائے جاتے ہیں ؂

مادھولال حسین

یہ وہی بزرگ ہیں جن کے نام پر اور جن کے عُرس کی وجہ سے لاہور کا میلہ چراغاں مشہور ہے۔ اور جس میں لاہور ضلع لاہور اور مفصلات لاہور کے علاوہ امرتسر۔ گوجرانوالہ۔ وزیرآباد۔ ایمن آباد تک کے لوگ آتے ہیں۔ مجمع عام کی تعداد کا صحیح شمار تو کبھی نہیں ہوا۔ لیکن عام اندازہ ایک لاکھ کے قریب کیا جاتا ہے ؂

"مادھولال حسین" بظاہر ایک انمل اور بے جوڑ سا نام معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ نام ہندو مسلم اتحاد کا عملی ثبوت اور طوطی ہند امیر خسرو دہلوی کے اس شعر کا صحیح مصداق ہے ؂

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کی تفصیلات آگے چل کر معلوم ہونگی ؂

حسینؒ کے والد کلس رائے نام ایک ہندو راجپوت نے بعہد شہنشاہ ہمایوں دین اسلام قبول کیا۔ حسین کی ولادت ۹۴۵ھ میں ہوئی۔ چنانچہ صاحب حقیقت الفقراء لکھتے ہیں ؂

چوں وجودِ مبارکش بہ جہاں | آمد از پردۂ عدم بہ وجود
بود آں سال در شمارِ عدد | چہل و پنج زیادہ بر نہ صد

۹۴۵ھ

؂ تاریخ لاہور کنہیا لال میں درج ہے۔ کہ حسین کلس رائے کا پوتا تھا ؂

حسین مولوی ابوبکر کی درسگاہ میں داخل ہوئے۔ جو اُس زمانہ میں ٹکسالی دروازہ کے باہر دریا کے کنارہ پر تھی۔ دس سال کی عمر تھی کہ قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اسی زمانہ میں ایک بزرگ حضرت شیخ بہلول ان سے ملے۔ اور انہوں نے اس کی رُوحانی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی۔

کتاب حقیقت الفقراء[1] میں جس کے بعض اقتباسات حضرت حسین کے متعلق تحقیقات چشتی میں درج ہیں۔ حضرت حسین کے مفصل حالات فارسی نظم میں درج ہیں۔ اور اُن میں اُن کے بہت سے خوارق عادات اور اُن کی کرامات کا ذکر ہے۔

مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ میاں حسن علیشاہ سجادہ نشین مزار مادھو لال حسین کے پاس گیا۔ اُس نے مجھے ایک بیاض دکھائی۔ جس میں حضرت حسین کے طبعزاد اشعار درج تھے۔ مگر اکثر اشعار ایسے تھے۔ جن کا قافیہ اور ردیف تو الگ وزن تک بھی درست نہ تھا۔ بخوف طوالت آپ کے کلام سے صرف دو شعر جن کا وزن قافیہ درست ہے۔ یہاں درج کئے جاتے ہیں

ے شاہدے خود را چو دیدم مست مست — تا لب لعلش رسیدم مست مست

ے ما ہمہ دردیم و درماں نیز ہم — بادہ صافیم و مستاں نیز ہم

حضرت حسین فارغ التحصیل ہونے کے بعد معاش کے لئے بافندگی کا کام کرتے رہے۔ ان کے ایک پیر بھائی شیخ ادرانی نام تھے۔ ان دونوں کی آپس میں چشمک تھی۔ حقیقت الفقراء میں لکھا ہے۔ کہ حضرت حسین کے بعد جب شیخ ادرانی ان کے مزار[2] پر آئے تو ٹھوکر لگا کر کہا ے

خفتہٴ زیر خاک لے جولاہ — از من و خود نہ کنوں آگاہ

---

[1] یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری۔ تحقیقات چشتی اور تاریخ کنہیا لال میں اس کے حوالے درج ہیں۔ پیر محمد نام کوئی بزرگ اس کے مصنف ہیں۔ اور انہوں نے چشم دید کرامتیں لال حسین کی لکھی ہیں۔ شیخ پیر محمد حضرت مادھو کے خادم خاص تھے۔ حقیقت الفقراء ۱۰۷۱ھ بعہد عالمگیر کی تصنیف ہے۔ [2] حضرت حسین (باقی حاشیہ برصفحہ)

در تو از حالِ خویش آگاہی	گو بمن شیر یا تو روباہی
این سخن چوں از و شنفت حسین	از تہِ خاکِ گور گفت حسین
کائے عجب ایں چہ گفتن است بمن	از تو انساں چہ لائق است بمن
یا بگویم ہمے زنی از رکیں	باز گوئی تو زینکہ حرف چنیں
گر نباشم ز حالِ خود آگاہ	پس من آگاہ کے شوم زالہ
بشنو از من کہ من خود آگاہم	چوئے اللہ ام بگو نہ جو لاہم
من کہ گویم سخن بہ گورِ دلیر	پس تو خود بیں کہ روبہ ام یا شیر

جب تک شیخ حسین نے طریقہ ملامتیہ اختیار نہیں کیا تھا۔ نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔ قرآن شریف بلا ناغہ پڑھا کرتے اور قریباً ہر روز مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش پر جا کر فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں دفعتاً تبدیلی پیدا ہو جانے کی یہ حکایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک دن شیخ سعد اللہ نامی ایک معلم ایک تفسیر سامنے رکھ کر اس امر کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ کہ زندگی بے اعتماد اور لہو لعب ہے۔ شیخ حسین نے کہا۔ جب خدا نے دنیا کی زندگانی کو لہو و لعب قرار دیا ہے تو اس کی تمام مخلوق ہی ایک لہو و لعب ہے۔ پھر ہم لہو و لعب ہی کیوں نہ کریں جو اس کھیل بنانے والے کا مقصد خاص ہے۔ یہ کہا اور اچھلتے کودتے اور ناچتے ہوئے مدرسہ سے باہر نکل آئے اور کپڑے بھی گیروے (سرخ) رنگ کے پہننے شروع کر دیئے جس سے ان کا نام "لال حسین" مشہور ہو گیا ۞

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) کے حالات کتاب بہاریہ۔ حقیقت الفقرا اور سیر العارفین میں درج ہیں۔ ان میں اس قسم کی بہت سی کرامات ان کی درج ہیں۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ایک اہل اللہ (شیخ ارزانی) اپنے پیر بھائی کی قبر کو اسکے مرنے کے بعد آکر ٹھوکریں مارے اور اس قسم کے کلمات اس سے کہے حضرت حسین کی عین حیات میں اس قسم کا مکالمہ ہوا ہو۔ تو تعجب نہیں ہے ۞ بعمر ۲۶ سال ۹۸۱ھ میں آپ نے

"ساقی و مطرب و شراب و رباب ۞ برگزیدہ و نہ کرد ہیچ حجاب" پر عمل کیا ۞

اس واقعہ کے بعد لال حسین کی زندگی میں ایک عجیب قسم کا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام کتابیں دریا برد کر دیتے ہیں یا کسی کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت۔ علمی و صوفیانہ تذکروں اور ورد و وظائف کی جگہ شراب کے دور شروع ہو جاتے ہیں۔ مکتبوں اور مسجدوں کی بجائے مے خانوں کا طواف پسند آتا ہے اور چنگ و رباب سے دلبستگی ہو جاتی ہے۔

لال حسین کی ایک کرامت کا ذکر صرف پُر لطف سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ لاہور میں شیخ حسّو تیلی ایک بزرگ گذرے ہیں۔ اوائل میں گندم فروشی کا کام کرتے تھے حضرت شاہ جمال کے فیضِ صحبت سے اپنی عاقبت سنوار لی۔ کچھ عرصہ کے بعد تیل بیچنا شروع کیا۔ اور حسّو تیلی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ دوکان ان کی چوک جھنڈا موری دروازہ میں تھی۔ حضرت لال حسین اسی رستے کبھی کبھی مستانہ حالت میں ہی حضرت داتا گنج بخش کے مزار پُر انوار پہ جایا کرتے تھے۔ جب حسّو تیلی کی دوکان پہ پہونچتے۔ تو وہاں معمول سے زیادہ شور و غل کرتے اور اُچھلتے کودتے۔ ایک دن حضرت حسّو تیلی نے کہا دربارِ رسالت میں تو تمہیں کبھی دیکھا نہیں یہ اُچھل کود کس شئ پہ ہے۔ لال حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اپنے اسی سُرور میں مست چلے گئے۔

اسی رات حضرت حسّو تیلی خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ بزمِ نبوی سجی ہوئی ہے سرورِ کائنات اولی افروز ہیں ایک چھوٹا سا خوبصورت لڑکا حضرتؐ کی گود میں آتا ہے۔ آنحضرت صلعم اس کو پیار کرتے ہیں۔ پھر وہ لڑکا تمام فقیروں۔ ولیوں اور صحابہ کرام سے پیار لیتا ہوا شیخ حسّو تیلی کی گود میں آتا ہے۔ اور بچّوں کی عادت کے مطابق ان کی ڈاڑھی سے چند بال نوچ لیتا ہے اور مجلس برخاست ہو جاتی ہے

دوسرے دن لال حسین اسی طرح شور و غل مچاتے چوک جھنڈا سے گذرتے ہیں۔ شیخ حسّو تیلی ان کو دیکھ کر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں فقیری اور ولایت کا دعویٰ کس کام۔ جب دربارِ نبوی تک رسائی نہیں لال حسین نے اس کے جواب میں ڈاڑھی کے چند بال دکھائے۔ اور واقعہ کا ذکر کیا۔ حسّو تیلی نے کہا۔ آخر معصوم

بچو بن کر نکر پہنچائی۔ بات جب تھی۔ کہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوتے۔ یہ کہکر حضرت حسّو تیلی نے حضرت حسین کو گلے لگا لیا۔ اور فرط جوش و سرور سے حسّو حسین حسین حسین کرکے نعرے مارنے لگے ۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ کہ اس مست الست فقیر کو اپنے مریدوں معتقدوں اور یاران ہم جلیس سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونا پڑا ۔

صاحب حقیقت الفقراء نے وصال کی کیفیت اس طرح لکھی ہے۔ آپ یاروں کے ہمراہ ایک روز کشتی پر سوار دریا (راوی) کی سیر کر رہے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک ریگستان نظر آیا۔ کشتیبان کو اشارہ کیا۔ اس نے وہاں اُتار دیا۔ آپ نے تیر و کمان سے دل بہلانے کا ارادہ کیا۔ دو چار تیر چلائے بھی۔ مگر پھر دفعتہً دل میں ایک خیال آگیا اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ دوستو! جب کوئی دوست حقیقی اپنے دوست کو اپنے پاس بُلائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع احباب نے جواب دیا۔ کہ اسے سو کام چھوڑ کر اپنے حقیقی دوست کا کہنا ماننا چاہیئے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا۔ اے بزم احباب یہ شمع انجمن (اپنی طرف اشارہ کر کے) اب بُجھنے کو ہے۔ یعنی ہمیں جناب الٰہی اپنے وصال میں طلب فرماتے ہیں۔ یہ کہہ کر بقول صاحب حقیقت الفقراء ۔

برہماں ریگ گسترید ردا	بر ردا خفتہ و داد جاں بخدا
وقت جاں دادن از دلش ناگاہ	نالہ آمد بروں کہ حق اللہ
چوں حق اللہ گفت جاں بسپرد	بادۂ وصلت البتہ خورد

شاہدرہ کے متصل جو جگہ حضرت لال حسین نے اپنے لئے پہلے ہی پسند فرمائی تھی وہاں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات کا واقعہ بعہد اکبر بروز جمعہ ماہ جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ کو پیش آیا۔ اس حساب سے آپ کی عمر ۶۳ سال کے قریب تھی ۔

چند سالوں کے بعد جب دریائے راوی میں سیلاب آگیا اور پانی کی لہریں حضرت

ف حقیقت الفقراء کے حوالہ سے تحقیقات چشتی میں لکھا ہے۔ کہ یہ سیلاب حضرت کی پیشینگوئی کے مطابق ان کی وفات سے بارہ برس کے بعد آیا تھا۔ اور لاش کی جگہ ان کے مرید کو قبر میں ایک گلدستہ دکھتا ہوا نظر آیا۔ اسی گلدستہ کو موجودہ مزار میں دفن کیا گیا ۔

کے مزار سے جو اُس وقت کچا تھا۔ ٹکر کھانے لگیں۔ تو محمد صالح نامی آپ کے مرید نے آپ کو باہر نکالا۔ اور آپ کو باغبانپورہ میں جسے اُس زمانہ میں بابوپورہ کہتے تھے دفن کیا۔ اس وقت نمازِ جنازہ دوبارہ پڑھی گئی۔ آپ کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ہزارہا تک تھی۔ مگر سجادہ نشینی کا فخر آپ کے محبوب و مرغوب مرید حضرت مادھولال حسین کو ملا +

شیخ مادھولال

مادھولال شاہدرہ کے ایک برہمن کا لڑکا تھا۔ ایک دن گھوڑا دوڑاتا حضرت شیخ حسین کی جھونپڑی کے سامنے سے گذرا۔ شیخ حسین اس کی فراست اور اس کی خوبصورتی اور جوانی دیکھ کر پھڑک اُٹھے۔ پوچھا کون ہے؟ کسی نے جواب دیا۔ شاہدرہ کے ایک امیر برہمن کا لڑکا ہے۔ اور نام اس کا مادھولال ہے +

شیخ ان دنوں قلندرانہ وضع رکھتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ سب کی صفائی تھی۔ شراب برملا پیتے تھے۔ اور شراب خانہ میں سب کے رُوبرو چلے جاتے تھے۔ ایسے شخص کا ایک ایسے نوجوان خوبصورت لڑکے سے اظہار محبت کرنا جو اُس کا ہم خیال و ہم عقیدہ بلکہ ہم مذہب بھی نہ ہو۔ سب کے لئے حیرت ناک تھا۔ مگر عشق وہ چیز ہے کہ نشیب و فراز۔ بدنامی و رسوائی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آسکتی۔ شیخ بھی شاہدرہ میں تلاشِ یار کے لئے گئے۔ اور آخر کامیاب ہوگئے۔ اُس زمانہ میں مادھو کی عمر ۱۵ سال تھی۔ اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی +

جب یہ واقعہ مادھو اور اُس کے والدین کو معلوم ہوا۔ تو وہ بہت گھبرائے۔ مگر حضرت شیخ حسین کا عشق معمولی عشق نہ تھا۔ آخر بقول ڈاکٹر اقبال ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے + پر نہیں۔ طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

رفتہ رفتہ مادھو کے دل پر بھی اثر ہوا۔ اور اب وہ وقت آیا کہ وہ بھی کبھی کبھی

حضرت کی بزم میں آنکلتا۔ اور شراب نوشی میں بھی مشغول ہوتا۔ مادھو کے والدین کو بیٹے کا یہ حال دیکھ کر سخت فکر دامنگیر ہوا۔ شیخ لال حسین کے قتل کے منصوبے سوچے جانے لگے۔ اِدھر اُدھر بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی نہ ہوئی ؛

آخر اُس کے والدین نے ہردوار جانے کے بہانہ سے بیٹے کو ساتھ لے جانا چاہا۔ شیخ لال حسین نے پہلے تو اجازت نہ دی۔ مگر جب مادھو نے اصرار کیا۔ تو انہیں مزاج یار کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا ؛

حقیقت الفقراء میں تو ہردوار کے اس واقعہ کو بھی حضرت حسین کی ایک کرامت بیان کیا گیا ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ شیخ حسین نے اجازت تو دیدی مگر یہ وعدہ لے لیا کہ تمہارے والدین پہلے چلے جائیں۔ میں تم کو خود ہردوار پہونچا دوں گا چنانچہ جب دن مادھو کے ماں باپ ہردوار پہونچے ہیں۔ اسی دن شیخ حسین نے مادھو کو کہا کہ میرے قدم پر قدم رکھو اور آنکھیں بند کر لو، زمین پر پیر مارو اور پھر آنکھیں کھول دو۔ مادھو نے اس پر عمل کیا تو اپنے آپ کو ہردوار میں پایا جہاں اس کے والدین بھی موجود تھے ؛

بہر حال یہ کرامت ہو یا اصل واقعہ۔ مادھو لال کا ہردوار جانا ثابت ہے۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے اعتقاد اور اُس کی محبت میں کوئی کمی نہ تھی۔ بلکہ واپس آنے کے چند دنوں کے بعد وہ علانیہ مسلمان ہو گیا ؛

بہت سے ہندوؤں نے یہ صلاح کی کہ لال حسین اور مادھو دونوں کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ لال حسین کو اپنا تو مطلق اندیشہ نہ تھا۔ مگر مادھو کی جان کو وہ نہایت عزیز رکھتے تھے۔ اسی اثنا میں راجہ مان سنگھ کو اکبر کی طرف سے مہم دکن پر جانے کا حکم ہوا۔ لال حسین کے ایماء سے مادھو مہم دکن میں بھرتی ہو کر لاہور سے باہر چلے گئے۔ اور اُس وقت واپس آئے جب مہم دکن میں راجہ مان سنگھ نے کامل فتوحات حاصل کر لیں۔ شیخ حسین کے نام سے راجہ مان سنگھ خوب آشنا تھا جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ میری فوج میں مادھو نام ایک نوجوان لڑکا حضرت حسین

کا مرید ہے۔ تو اُس نے اُس کو اپنے پاس بُلایا۔ اُس کی عزت کی اور کہا۔ اپنے پیر و مرشد کا تصور باندھ کر اس مہم میں اُن کی دعا حاصل کرو۔ مادھو نے ایسا ہی کیا اور جب مان سنگھ کو کامیابی ہو گئی۔ تو اُس کا اعتقاد لال حسین کے متعلق بہت زیادہ ہو گیا۔

ایک مرتبہ ہولی کے ایام تھے۔ لال حسین نے کہا ہم اپنے یار جانی (مادھو) کی خاطر ہولیاں کھیلنا چاہتے ہیں۔ مادھو لال کا اتنا سُننا تھا۔ کہ یہ نازِ معشوقانہ بہت سا گلابی رنگ اُس نے حضرت لال حسین پر ڈال کر اُن کے تمام کپڑے لت پت کر دیئے۔ حضرت کے مرید اور معتقد لال حسین کی اس شوخی پر لال پیلے ہو گئے۔ بلکہ حضرت لال حسین سے اُنہوں نے کہہ بھی دیا۔ آپ نے اس چھوکرے کو سر چڑھا رکھا ہے۔ حضرت لال حسین تو کسی اور ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان پر وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ اور اُنہوں نے ناچنا شروع کر دیا۔

اسی طرح بسنت کے موسم میں لاہور کی اکثر طوائفیں بسنتی رنگ کے کپڑے پہن کر جب . . . لال حسین کے سلام کو آتی تھیں۔ تو آپ کے مرید و معتقد بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ مادھو لال اور خود حضرت لال حسین بھی سر تا پا "بسنت" نظر آتے تھے۔

لال حسین تا حین حیات ہر سال بسنت کی خوشی منایا کرتے تھے۔ ان کے بعد بھی ان کے مزار پر بسنت کے دن سرود و سماع اور رقص و رنگ اندازی ہوتی ہے لال حسین اور شیخ مادھو نے یہاں تک یکرنگی اختیار کی۔ کہ دونوں کا نام مادھو لال حسین مشہور ہو گیا۔ اور عوام اب اصلیت سے یہاں تک بے خبر ہیں کہ مادھو لال حسین کو ایک ہی نام تصور کرتے ہیں۔ اور اصل حقیقت و کیفیت سے بالکل بیخبر ہیں۔ آخر جب حضرت مادھو باغِ عالم کی سیر سے سیر ہو گئے۔ اور اپنی پیر و مرشد اور عاشق صادق کی یاد دل میں ایک ٹیس اور کلیجہ میں درد پیدا کرنے لگی۔ تو ملکِ بقا کے سفر کی تیاری کی۔ چنانچہ حضرت حسین کی وفات کے اڑتالیس سال بعد ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ

کو دوشنبہ کے دن شاہجہان کے زمانہ میں انتقال فرمایا۔ اور ہم پہلوئے مزار حضرت لال حسین دفن کئے گئے۔

خانقاہ مادھو لال حسین

لاہور کی یہ مشہور و معروف خانقاہ جو موضع باغبانپورہ کے متصل بجانب شمال واقع ہے۔ پختہ چار دیواری سے محفوظ ہے۔ دروازہ کلاں جو آمد و رفت کے لئے ہے مغرب کی طرف ہے۔ ایک دروازہ جنوب یعنی باغبانپورہ کی جانب ہے۔ مشرق کی طرف بھی ایک دروازہ ہے جس کو بہشتی دروازہ[1] کہتے ہیں۔

احاطۂ دربار یعنی خانقاہ حضرت مادھو لال حسین کی زمین کا رقبہ چار گھماؤں کے قریب تھا۔ مگر بہت سی عمارتیں کھنڈرات کا ڈھیر ہو گئیں۔ باغ باغیچہ جو تھا وہ ویران ہو گیا۔ چار دیواری بالکل شکستہ ہو گئی۔ اگر یہ مزار شہر میں کسی جگہ ہوتا۔ تو آج اس کے ٹوٹے پھوٹے آثار بھی نظر نہ آتے۔ مجاور اور سجادہ نشین اور متولی سب مل ملا کر کھا پی جاتے اور صرف مادھو لال حسین کا مزار اور چبوترہ باقی رہ جاتا۔ اس لئے جو کچھ بھی اب باقی ہے غنیمت ہے۔

نواب ذکریا خاں نے نظامت لاہور کے ایام میں بعہد محمد شاہ بادشاہ ایک خوشنما کانسی کار مسجد حضرت لال حسین کے روضہ کے مغرب کی طرف تعمیر کرائی تھی۔ وہ مسجد تو موجود ہے۔ مگر اسلامی حکومت کے ضعف مسلمانوں کی غفلت اور جابر حاکموں کی غیر ہمدردی کی وجہ سے اب صرف اس کے آثار ہی قائم ہیں۔ جو اس کی مٹی ہوئی شان و شوکت کی شہادت دیتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ کنواں غسل خانہ۔ سقاوہ بلکہ چاہ کلاں بھی جنوب رویہ موجود ہے۔ مسجد کا دروازہ جو بہت شاندار تھا اب بغیر طاق تختوں کے ہے۔

[1] اس نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ حضرت لال حسین نے فرمایا تھا۔ کہ بسنت کے دن جو کوئی اس دروازہ سے گذریگا وہ بہشتی ہے۔

صحن مسجد موجود مگر ناگفتہ بہ حالت میں. صحن کے گرد جو دیوار ہے وہ تا بہ گردن بلند تھی۔
مسجد کا دروازہ سطح زمین سے دو تین فٹ بلند تھا۔ اور پختہ زینوں کے ذریعے مسجد
میں داخل ہوتے تھے۔ غرب رویہ جو سقف درجہ تھا شکستہ ہو جانے کی وجہ سے ایک
اہل دل بزرگ منشی غلام رسول ملازم بارکماسٹری نے ۱۲۶۹ھ میں دوبارہ اس کی
مرمت کرا دی تھی۔ مگر اب پھر وہی حال ہے۔

۱۲۸۰ھ کے قریب مسجد کے بہت سے آثار موجود تھے۔ تحقیقات چشتی میں مسجد
کی عمارت کے متعلق اس کی تفصیلات درج ہیں۔ شرقی محراب میں رُخ مسجد کے اوپر
نیلا۔ آسمانی۔ سفید اور کانسی کار کام نہایت خوبصورت تھا۔ اور بخط عربی بسم اللہ الرحمن الرحیم
اور پھر افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ و بہ نستعین درج ہے۔
شمالی محراب کی طرف کانسی کار ٹکڑوں میں جن کی زمین نیلی اور گلکاری سفید ہے
برنگ سیاہ یہ ابیات تحریر ہیں ؎

خواست در دورِ شاہ ملک پناہ — شاہِ ہندوستاں محمد شاہ
عالم و عادل و سخی بزماں — در صفِ معرکہ چو شیر ژیاں
زبدۂ بارگاہِ او نواب — ذکریا خان صوبۂ پنجاب
بہ خواہش اگرچہ جمشید است — لرزہ در تن فتادہ چوں بید است

یہ چاروں مصرعے دو سطروں میں ختم ہیں۔ اس کے بعد یہ اشعار درج ہیں ؎

نیک نام کہ نیک نامۂ او — ہم چو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد نو خود بنا بکند — عالی و خوب و خوشنما بکند
محض بہر خدا کند ایں کار — تا نمازی شود نماز گذار
باز ہر چہ ثواب زاں آید — بہ سوئے بانیش بکن عاید

محراب جنوبی کی طرف بھی شمالی محراب کی طرح کانسی کار کام کے چار ٹکڑے بنا کر ان
کے وسط میں تعمیر مسجد کا حسب ذیل قطعہ تاریخ درج ہے ؎

یارب از لطف خود نگاہش دار — از شکستن تو در پناہش دار

کرد احداث مسجدے محکم | نیز ایں حوض و چاہ مستحکم
نزدِ درگاہِ صاحبِ عرفاں | واقفِ اسرارِ حضرتِ رحماں
آنکہ معروف شد بہ لال حسینؓ | خاکِ نعلین اوست سرمۂ عینؓ
کرد معمار چوں بصد تدبیر | مسجد و چاہ را بنکو تعمیر
سالِ تاریخ او چنیں آمد | مسجد نیک ماثیجاں[1] ...

اس کے ساتھ ہی دوسرا قطعہ تاریخ بھی درج ہے جو حسب ذیل ہے ؎

چوں ایں مسجد گاہ از پے خاطرِ عام | بنا یافت از سرورے نیک نام
ز تاریخِ او ہر کہ خواہد شمار | بداند ہزار و صد و چہل و چار

مسجد کی دیواروں اور محرابوں کے سرخیوں وغیرہ پر "نقش و نگار" کی شہادت کے لئے رنگ آمیزی خطوط کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔

احاطۂ دربار میں ایک مکان، مکان ثبوت شاہ کے نام سے ہے۔ وہ حضرت مادھو لال حسین کے خدام ہی سے تھے۔ ان کو بھی صاحبِ کرامات بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ انہی کی مہربانی سے لاہور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ سے محفوظ رہا۔ ۱۲۲۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس مکان کی غربی جانب ثبوت شاہ کی تصویر معہ شراب کی بوتلوں کے اُن کے مذاق اور اُن کے حالات کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے۔

دروازہ کلاں یعنی ڈیوڑھی حضرت مادھو لال حسین کی وفات کے بعد مسخ کر گئے از سرِ نو بنوائی گئی۔ البتہ اس کا اندرونی در محرابی زمانہ قدیم ہی کا ہے۔ بعہد مہاراجہ دلیپ سنگھ اس ڈیوڑھی کو سات زینہ لگا کر دو منزلہ بنایا گیا۔

چاہِ کلاں جو مسجد کے متصل ہے اس پر چرخ چوب جاری تھا ۱۲۷۵ھ میں میر وزیر علی تحصیلدار لاہور نے اس کو بند کرا دیا۔ اس چاہ کے شمال کی طرف چار دیواری کے اندر ایک چبوترہ چونہ گچ سفید ہے۔ یہ مقام شیخ ارزانی کا چلہ گاہ بتایا جاتا ہے۔ جو لال حسین کے پیر بھائی تھے۔ اور جن کا مزار پٹنہ میں ہے۔ اب یہ چبوترہ

[1] آگے حرف ٹوٹ گئے ہیں۔ پڑھے نہیں جاتے۔

بوسیدہ ہو کر گر گیا ہے۔ اور اس میں درخت کریر وغیرہ اُگے ہوئے ہیں ۔

چار دیواری کے اندر ایک موٹھڑہ کلاں ہے۔ جس کا دور ہر طرف سے ساڑھے تین گز ہے۔ اس کے جنوب کی طرف ایک حجرہ مسجد ہے۔ جہاں شیخ مادھو نشست فرمایا کرتے تھے ۔

وہ بخارچہ دبارہ دری، جس کی بیرونی دیوار پر بجانب مشرق سنگ مرمر کے پتھر پر "این مکان از بندہ غلام رسولؐ" لکھا ہوا ہے۔ سجادہ نشین کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور اسی مقام کو گدی بھی کہتے ہیں۔ مقام گدی کے متصل ایک اور مسجد ہے جو ۱۲۷۵ھ میں بیگم طوائف والدہ مومان محبوبہ رنجیت سنگھ نے تیار کرائی تھی مسجد نہایت خوبصورت ہے۔ اُس زمانہ میں اس مسجد پر دو ہزار روپیہ لاگت آئی تھی ۔

احاطہ دربار کے اندر اس وقت ساٹھ ستر سے زیادہ قبریں خدام اور دربار کے فقراء ہی کی ہیں کچھ متفرق بھی ہیں۔ احاطہ مزار کی چار دیواری میں بیسیوں مکانات اور کئی گنبد خورد و کلاں تھے۔ ان میں سے بہت سے مٹ گئے۔ بہت سے باقی ہیں ۔

مقام تخت جس کو چبوترہ مزار معلّی بھی کہتے ہیں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ معز الدین[1] بن جہاندار شاہ کا بنا کردہ ہے۔ یہ تمام چبوترہ چونہ گچ ہے۔ اس کے چاروں طرف پنجرہ ہائے رنگین خشتی نصب ہیں۔ اور چاروں گوشوں پر چار مینار تا بہ سینہ بلند ہیں چبوترہ ہذا کے جنوب کی طرف ایک چوکھٹ سنگِ مرمر کی سوا گز بلند اور ۱۲ گرہ چوڑی ہے۔ اب اس میں تختہ ہائے چوبی لگے ہوئے ہیں ۔

اسی احاطہ میں ایک چبوترہ ہے جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے عہدِ حکومت

---

[1] بہادر شاہ شاہ عالم بن عالمگیر کے بعد بعمر ۶۵ سال ۱۸ محرم بروز جمعہ ۱۱۲۴ھ کو تخت پر بیٹھا۔ اور گیارہ ماہ پانچ یوم کی حکومت کے بعد ۱۱۲۵ھ میں انتقال کر گیا۔ معز الدین اپنی گردش کے ایام میں لاہور میں تھا۔ اس نے مزار حضرت مادھو لال حسین پر حاضر ہو کر یہ اقرار کیا۔ کہ اگر مجھے تخت نصیب ہو گیا۔ تو میں حضرت کے مزار پر سائبان چوب ہائے طلائی نذر کروں گا۔ چنانچہ اس نے تخت نشین ہو کر اپنا وعدہ پورا کیا ۔

میں بسنت کے دن ڈیرہ کیا کرتے تھے۔ اس چبوترہ کے پاس سائبان اور قناتیں لگ جاتی تھیں۔ جہاں امرائے دربار قیام کرتے تھے۔ مہاراجہ بسنت کے دن دربار مادھو لال حسین میں خود بھی نذر دیتے اور اپنے امیروں سے بھی نذریں دلواتے تھے۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ ۱۸۳۹ء اور ان کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ و مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد حکومت ۱۸۴۹ء تک زندہ[1] تھے لکھتے ہیں " بسنت کے صرف ایک ہی دن میں سجادہ نشین کو چار پانچ ہزار روپیہ نذر نیاز کا مل جاتا تھا۔ اور اب ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں ابروز میلہ بسنت صرف ۲۵ روپیہ سجادہ نشین کو آمدنی ہوئی ہے "۔

لال حسین کے تعویذ پر ہمیشہ غلاف پڑا رہتا ہے۔ اس تعویذ کے نیچے تین چبوترے ہیں جن میں سے دوسرے پر شیخ مادھو کا مزار ہے۔ جس پر عرس کے دن غلاف ڈالا جاتا ہے چبوترہ کو مزار لال حسین کی وجہ سے تخت اور احاطۂ مزار کو دربار بھی کہتے ہیں۔

راقم الحروف ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو مزار مادھو لال حسین پر گیا جن عمارات کا تحقیقات چشتی میں پتہ لکھا ہے۔ ان میں سے بہت سی مٹ گئی ہیں۔ اب تو احاطۂ مزار اور مسجد نواب زکریا خان کے سوا چاروں طرف کھنڈرات ہی نظر آتے ہیں بلکہ جن عمارات کو راقم الحروف نے ۱۹۱۵ء میں دیکھا تھا۔ اب ان میں سے بھی کئی ایک نظر نہیں آتیں

مزار مادھو لال حسین پر نذر نیاز اور معافیات وغیرہ

لال حسین اور شیخ مادھو کی روش ظاہری ہر چند شریعت اسلام کے خلاف تھی۔ لیکن اس پر بھی ان کی بزرگی و شہرت کا اس قدر چرچا تھا۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں لوگ ان کے سلسلہ میں داخل تھے۔ اور شاہان مغلیہ میں سے جو بادشاہ لاہور آتا تھا۔ وہ

---

[1] آپ کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں دوران طباعت تحقیقات چشتی میں ہوا ہے۔ آپ کی کتاب آپ کی وفات کے بعد چھپی تھی۔

دیگر مزارات کے علاوہ اس روضہ پر بھی حضور آتا تھا۔ نذریں چڑھاتا۔ سر تسلیم خم کرتا۔ اور مجاوروں۔ سجادہ نشینوں کی بہت کچھ پرورش کرتا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے خونریز بادشاہ بھی اس خانقاہ پر سر نیاز جھکا کر کبر و غرور کی کمر توڑ گئے ہیں۔ ناظمان لاہور بھی دل و جان سے لال حسین کے ارادتمندوں میں تھے۔ نواب زکریا خاں تو خصوصیت سے آپ کے خوارق عادات اور کرامات کا قائل تھا۔ خانقاہ کی مغربی جانب اس کی بنا کردہ مسجد جس کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اب تک اُس کی ولی ارادت مندی کا ثبوت دے رہی ہے؛

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وجود لاہور کی اسلامی عمارات کے لئے ایسا ہی تھا جیسے بجلی کا تعلق کسی بلند آشیان یا کسی سر بفلک عمارت کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ لاہور کا کوئی اسلامی مقبرہ اسکی زد سے نہیں بچ سکا۔ کوئی مسجد اس کی ضرب سے خالی نہ رہ سکی۔ مگر مزار مادھو لال بڑا خوش قسمت تھا۔ کہ نہ صرف وہ سلامت رہا۔ بلکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ وہاں بسنت اور عرس کے دن خود آتا اور نذریں پیش کرتا؛

یہ صحیح ہے کہ اس مزار پر بہ نسبت اور مزاروں اور مقبروں کے سنگ مرمر اور دیگر قسم کا قیمتی پتھر کم تہا۔ اور اسی لئے خیال ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کی دستبرد سے بچ رہا ہے لیکن مزار کا رقبہ جو چار گھماؤں تک بیان کیا جاتا ہے اس قدر وسیع تہا۔ کہ رنجیت سنگھ چاہتا۔ تو اپنے کسی سکھ سردار کو توپ خانہ یا بارود خانہ کے لئے یہ جگہ دے سکتا تہا۔ اس لئے اس کے محفوظ رہنے یا کم سے کم رنجیت سنگھ کے ہر سال یہاں آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہئے؛

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ بیگم طوائف کو اس مزار کے ساتھ دلی عقیدت تھی چنانچہ اسی عقیدت مندی کے ثبوت میں اُس نے یہاں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ بیگم چونکہ موراں طوائف کی والدہ تہی اور موراں رنجیت سنگھ کی وہ محبوبہ تھی۔ کہ اُس کے نام کا سکہ تک پنجاب میں چل گیا۔ اور بڑے بڑے درباری اور مصاحب کیا سکھ اور کیا ہندو گرے اس کا مجرا کرنے کے بعد مہاراجہ کا سلام کرتے تھے۔ اور چونکہ طوائفیں اس مزار پر ہر کثرت

آتی تھیں اور خصوصاً عُرس اور بسنت کے دن تو یہاں شاہدانِ بازاری کا جمگھٹا ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ کو موراں کی خاطر منظور تھی اور موراں کو اپنی برادری کی اور اس کی برادری یعنی طوائفوں کو مادہو لال حسین سے دلی عقیدت تھی۔ اس لئے موراں طوائف کی طفیل یہ مزار مہاراجہ کے ہاتھوں سے نہ صرف بچ سکا بلکہ مہاراجہ ہر سال یہاں نذر بھی دیتا رہا ہ

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ صرف مہاراجہ کے آنے کی وجہ سے بسنت کے دن اس مزار کے سجادہ نشین کو چار پانچ ہزار روپیہ کی نقد امداد نذر نیاز کے ذریعہ مل جایا کرتی تھی۔ مہاراجہ نے خانقاہ کی مرمت اور فقیروں اور عُرسوں کے اخراجات کے لئے حکم دیا۔ کہ ہر چند میں بادشاہانِ مغلیہ کی برابری نہیں کر سکتا تاہم بطور مدد امداد کچھ نہ کچھ حاضر کیا کروں گا۔ چنانچہ مہاراجہ نے اس مزار کے لئے مفصلہ ذیل معافیات واگذار کیں (۱) چاہ موراں والا یعنی موراں طوائف کا کنواں جس کی زمین ۳۶ بیگھ ہے یہ معافی موراں طوائف کے انتقال کے بعد مزار مادہو لال حسین کے نام ہو گئی تھی (۲) چاہ جس کی زمین ۲۰ بیگھ ہے (۳) چاہ ہیرو والا جس کی زمین ۳۴ بیگھ ہے (۴) چاہ جس کی کل زمین ۶۶ بیگھ ہے (۵) ضلع امرتسر میں ایک چاہ جس کی زمین دس بیگھ ہے (۶) موضع فتح گڑھ ضلع لاہور میں ایک بیگھ زمین (۷) اٹاری ضلع امرتسر میں سات بیگھ زمین (۸) موضع کوٹ بیگم میں تین بیگھ زمین ۔

یہ معافیات سکھوں کے آخر عہد تک برابر قائم رہیں۔ بلکہ مہاراجہ کھڑک سنگھ مہاراجہ شیر سنگھ اور آخری سکھ مہاراجہ دلیپ سنگھ نابالغ بھی اس مزار پر بسنت کی تقریب میں آتے رہے ہیں ۔

عُرس مادھو لال حسین یا میلہ چراغاں

عُرس کی تاریخ حضرت لال حسین کی تاریخ وفات سے ایک سال بعد شروع ہوئی ہے

جس کو آج یعنی ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں ۳۷۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ پہلے آپ کا عُرس قمری حساب کے مطابق ہوتا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ تاریخ عرس کبھی سردیوں میں آجاتی ہے اور زائرین اور مسافروں اور سوداگرانِ اسپان کو موسم کی تبدیلی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے ۱۸۶۳ء میں ہمیشہ کے لئے تاریخ عرس کا یہ فیصلہ کردیا گیا۔ کہ عُرس ہر چیت کی چودھویں اور ہر مارچ کے مہینے کی آخری تاریخ کو ہوا کرے۔ کیونکہ ان دنوں میں موسم بہار کے سبب زائرین کو گرمی و سردی کی ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔ اب عُرس ہر سال کے ماہ مارچ کے آخری ہفتہ کی رات کو ہوتا ہے۔ چراغاں کی روشنی سے تمام مزار اور اس کا احاطہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک اُٹھتا ہے۔ اس رات کو مزار کے وسیع رقبہ کی جو کیفیت سیر چراغاں سے ہوتی ہے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے رات کو دن کا سماں نظر آتا ہے۔ اور چونکہ جس طرف جاؤ۔ چراغ ہی چراغ نظر آتے ہیں۔ اس لئے عُرس کی بجائے اس کا نام میلۂ چراغاں ہی مشہور ہو گیا ہے۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کہ زائرین اور عُرس پر آنے والے لوگوں نے کس زمانہ سے شالامار باغ میں میلۂ چراغاں شروع کیا ہے۔ مگر اس قدر قیاساً ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ جب سلطنتِ مغلیہ کو ضعف آیا۔ تو ناظمانِ لاہور اور سکھوں کے زمانہ میں جو لوگ حضرت مادھو لال حسین کے عُرس پر آیا کرتے تھے۔ اُن میں سے اکثر لوگ تفریح طبع کے لئے شالامار باغ میں بھی چلا جایا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ دستور یہاں تک رواج پا گیا۔ کہ اصل غرض یعنی عُرس کو بہت لوگ بھول گئے۔ اور تمام رونق اور آمدورفت شالامار باغ ہی میں منتقل ہو گئی۔

آج سے نصف صدی پیشتر تک عُرس حضرت مادھو لال حسین پر لاہور کے علاوہ امرتسر کی طوائفین بھی آتی تھیں۔ اور اپنی زرق برق پوشاکوں۔ اپنے حسنِ دلکش اور اپنی خوش آوازی کے جوہر دکھاتی تھیں۔

سجادہ نشینوں کا یہ حال ہے۔ کہ اُن کے اکثر افراد خادم گدائی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ خانقاہ کے نام کوئی معافی یا جاگیر نہیں ہے۔ جہاں بڑے بڑے امراء وزراء کا

خوشنامی وقت حاضر ہوتے تھے۔ جہاں امرتسر اور لاہور کی نامی اور چیدہ طوائفیں اور ملک کے مشہور و ممتاز قوال اہلِ بزم کو حال سے قال میں لاتے تھے۔ زمانہ کی روش نے اب اس قسم کے ہنگامے وہاں بہت کم کر دئے ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ اس قسم کی نامشروع حرکات بالکل بند کر دی جائیں ؀

خانقاہ مادھو لال حسین اور مہاراجہ رنجیت سنگھ

گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ بسنت کے دن مہاراجہ رنجیت سنگھ خود دربار مادھو لال حسین پر آتے تھے اور نذر و نیاز دیتے تھے اب تھوڑی سی کیفیت مہاراجہ کی سواری و حاضری کی تحقیقاتِ چشتی سے لکھی جاتی ہے۔ جس کے مصنف اُن دنوں بقید حیات تھے۔ آپ لکھتے ہیں :-

مہاراجہ کا یہ معمول تھا۔ کہ بسنت کے دن اپنے تمام امراء و وزراء اور افواج اور اُن کے ادنےٰ و اعلےٰ افسروں کو بسنتی لباس اور بسنتی وردی پہننے کا حکم دیتے۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے زین۔ ہاتھیوں کے ہودج اور تمام اسلحہ جات کے غلاف بھی بسنتی ہوتے تھے اور ساتھ ہی حکم دیدیا جاتا تھا۔ کہ حضرت کے مزار پُر انوار پر بسنتی رنگ کے خیمے نصب کئے جائیں خیمے قناتیں سب بسنتی رنگ کی ہوتی تھیں۔ قلعہ کے دروازہ سے لے کر مزار کی حد تک دو رویہ فوج بسنتی لباس پہنے ہوئے عجب بہار دکھاتی تھی۔ امیر و رئیس کو حکم تھا۔ کہ وہ بھی بسنتی رنگ کا لباس پہنیں اور اُن کے ملازم بھی۔ رعایائے شہر میں سے مردوں کے علاوہ ہندو ہوں یا مسلمان کئی ایک عورتیں اور بچے بھی اسی رنگ میں ملبوس نظر آتے تھے۔ غرض رنگیلے مہاراجہ کی خوش مذاقی سے شہر کے در و دیوار اور کوچہ و بازار بسنتی نظر آتے تھے ؀

بسنت سے ایک دو دن پہلے بسنتی دستار رنگوانے کا نرخ اُس زمانہ میں چار آنے تک پہنچ جاتا تھا۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں۔ مجھے بخوبی یاد ہے عہد مہاراجہ شیر سنگھ

بروز بسنت احقر راجہ دینا ناتھ[1] کے پاس موجود تھا۔ میری موجودگی ہی میں رنگریز اُن کی دستار رنگ کر لایا۔ راجہ صاحب نے رنگریز کو پانچ روپے نانک شاہی عنایت کئے۔ رنگریز نے کہا۔ مہاراج! پانچ روپیہ تو فوج کے جمعدار اور صوبیدار بھی دیدیتے ہیں۔ مَیں تو زیادہ کا اُمیدوار تھا۔ یہ سن کر راجہ صاحب نے تبسم فرمایا اور علاوہ نقدی کے ایک چوغہ قیمتی پچاس روپے کا عطا کیا۔

دو بجے کے قریب توپوں کی پیہم و مسلسل آوازوں سے اہلِ لاہور کو معلوم ہو جاتا کہ مہاراجہ کی سواری قلعہ سے روانہ ہو گئی ہے۔ سب لوگ بازاروں میں اور دکانوں پر سرکار کا جلوس دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ جب مہاراج کی سواری میلہ میں آتی۔ تو دل کو وہ لطف اور آنکھوں کو وہ سرور حاصل ہوتا تھا۔ کہ اب اُن ایام گذشتہ کا خیال بھی آجاتا ہے۔ تو چشم پُرآب ہو جاتی ہے"

ساٹھ ستر ہاتھی بسنتی ہودجوں سے سجے ہوئے عجب ہیبت اور جاہ و جلال دکھلاتے تھے۔ چار پانچ سو گھوڑے جن کے زین مرصع اور بسنتی ہوتے تھے اپنی چہل پہل سے عجب عالم پیدا کرتے تھے۔ ڈیرہ سواران چار یاری اور دو رجمنٹ پیدل اردل کے جلو میں ہوتے تھے۔ مہاراجہ قلعہ سے لے کر تا مزار پُر انوار روپوں کی مٹھیاں بھر بھر کے تصدق کرتے اور دو رویہ پھینکتے آتے تھے۔ جب مزار کی چار دیواری آجاتی۔ تو سواری سے اُتر کر پاپیادہ ہو جاتے۔ اور جب بہ ارادت تمام معہ روسائے عالیمقام برہنہ پا ہو کر خانقاہ کے دروازہ کے اندر قدم رکھتے۔ تو پھر انواپ کی سلامی ہوتی جس سے سب کو معلوم ہو جاتا۔ کہ اب سرکار دربار میں پہنچ گئے ہیں"

مہاراجہ احاطۂ دربار کے اندر جاکر ایک مقررہ چبوترہ پر بیٹھ جاتے۔ اور گیارہ سَو روپیہ نقد معہ ایک بیش قیمت بسنتی دوشالہ کے خانقاہ پر نذر چڑھاتے جبیں سائی کرتے اور پھر خیمہ شاہی میں رونق افروز ہو جاتے۔ جہاں عرش سے فرش تک سب کچھ بسنتی نظر آتا تھا۔ تمام ملازمین سے علیٰ قدر مراتب نذریں لیتے اور خلعت ہائے فاخرہ

[1] اُس زمانہ میں دیوانی کا خطاب تھا۔ خطاب راجہ انگریزوں کے عہد میں ملا تھا۔

سے ان کو سرفرازی بخشتے۔ اور عطر عنبیر و گلال جشن ہولی کی طرح اُڑایا جاتا۔ پھر لالہ رُخان حور وش یعنی تمام طوائفانِ لاہور و امرت سر حسب الحکم وہاں حاضر رہتی تھیں مجرائے شاہانہ ادا کرتیں۔ اور نوبت بہ نوبت سرکار کی تفریح طبع کے لئے ناچ میں مشغول ہو کر انعامات گوناگوں سے سرافراز ہوتیں"۔

بسنت کے دن جس قدر روپیہ و اشرفی مہاراج کو بطور نذر حاصل ہوتا وہ خدمت گارانِ شاہی کو بہ تقریب انعام بسنت تقسیم کر دیا جاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ ایک ایک ماہ کی تنخواہ تمام فوج سوار و پیادہ کو بطور انعام تقسیم ہوتی تھی۔ جب شام کا وقت قریب ہوتا۔ تو مہاراج اتواہب کی سلامی کے ساتھ شہر کو واپس چلے جاتے۔ اور جس طرح آتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے روپے اور ٹنکیاں پھینکتے آتے تھے اُسی طرح واپسی کے وقت بھی روپیہ اور اشرفی کا مینہ برساتے ہوئے قلعہ میں آجاتے تھے"۔

باغبانپورہ

جبو | پاک پٹن کے رہنے والے ایک غریب الوطن مسافر کو اس کی یاوری قسمت اکبر بادشاہ کے حضور میں لے گئی۔ حکم ہوا۔ کچھ کام بھی جانتے ہو۔ مسافر نے کہا۔ زمیندار ہوں اور زراعت و کاشتکاری کا کام بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بادشاہ کے حکم سے اس کو لاہور کے شمال مشرق کیطرف بنجر اور ویران زمین آباد کرنے کی اجازت ملی۔ خوش نصیب مسافر نے چار ہزار بیگھہ اپنے تصرف میں لاکر وہاں اپنے نام پر ایک گاؤں جبو آباد کیا۔

رائے بابو | اس کے بیٹے رائے بابو کے زمانہ میں اس کو بہت ترقی ہوئی۔ اس نے موضع جبو کے پہلو میں اپنے نام پر بابو پورہ آباد کیا۔ لال حسین کے زمانہ تک اس موضع کا نام بابو پورہ ہی تھا۔ بعہدِ شاہجہان ۱۰۴۰ھ میں رائے بابو کی اولاد نے مہر جبیتھا کے پاس اس

موضع کو فروخت کر دیا ۔

مہر جیٹھا

مہر جیٹھا نے اس موضع کا نام باغبانپورہ رکھا۔ اس میں اپنے رہنے کے لئے پختہ مکانات تعمیر کرائے اور موضع کو خوب رونق دی۔ وہ مکانات تو اب کہیں نظر نہیں آتے۔ قدیمی قبرستان کی صرف چار دیواری موجود ہے ۔

مہر مہنگا

مہر جیٹھا کے سسرال باغ دلکشا[۱] واقعہ شاہدرہ کے داروغہ تھے۔ مہر مہنگا مہر جیٹھا کا بیٹا تھا۔ نہایت حسین اور قبول صورت۔ ایام طفولیت میں اپنے نانا کے ساتھ باغ میں جاتا تھا۔ اور کئی کئی دن وہیں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں اس کی عمر پانچ چار سال سے زیادہ نہ تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں جب باغ کی سیر کو آتیں تو پردہ کا اس قدر انتظام ہوتا تھا۔ کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ مگر مہنگا کی خوردسالی کی وجہ سے اس کو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وہ اپنی عمر کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کے ساتھ کھیلتا۔ دوڑتا اور بچپن اور بھولا پن کی جو ادائیں ہیں بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کرتا ۔

جب شاہجہان نے شالامار باغ کی تعمیر شروع کی۔ اس وقت مہر مہنگا اپنی جوانی کے عالم میں تھا۔ اس کے نانا کا رسوخ شاہی باغ دلکشا کے شاہی داروغہ ہونیکی وجہ سے سرکار دربار میں بہت کچھ تھا۔ اور مہر مہنگا کے بچپن کا تعارف بھی جو شاہزادوں اور امرائے دربار سے تھا ۔ اب کوئی نہ کوئی نتیجہ پیدا کرنے والا تھا۔ ان دونوں باتوں نے مل کر مہر مہنگا کو شالامار باغ کا سب سے پہلا شاہی داروغہ مقرر کرا دیا۔ اس کے بعد مہر مہنگا کا رسوخ یہاں تک بڑھ گیا۔ کہ وہ لاہور کے تمام سرکاری باغات کا منتظم و مہتمم قرار پایا ۔

۱۰۸۰ھ میں بعہد عالمگیر مہر مہنگا کا انتقال ہو گیا ۔

مہر مہنگا کی اولاد

مہر جیٹھا بانی موضع باغبانپورہ کو غالباً لکھا پڑھا نہیں تھا۔ البتہ مہر مہنگا اس خیال سے کہ امرائے دربار اور شاہزادوں تک اس کی رسائی اور نشست برخاست تھی۔ مروجہ علوم سے واقف تھا۔ اس نے اپنی اولاد کو نہ صرف پڑھایا بلکہ وہ اچھے اچھے فاضل

[۱] اسی باغ کا نام اب باغ نورجہاں یا مقبرہ جہانگیر ہے ۔

مشہور ہوئے۔ اس کے بیٹے بھی قابل تھے۔ اور اس کے پوتے اور پڑپوتے تو علاوہ علوم درسی میں ماہر ہونے کے قرآن شریف کے بھی حافظ تھے۔ اور شالامار باغ کی خدمت داروغگی بھی انہی کے سپرد تھی ٭

زمانۂ بے اطمینانی | نادر شاہ کے حملۂ ہند کے بعد جب سلطنت مغلیہ بے حد کمزور ہو گئی۔ اور نادر شاہ کی تقلید میں احمد شاہ ابدالی نے بھی پنجاب پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ اور بعہد نظامت نواب زکریا خان جب بیگم پورہ دار السلطنت ہونے کی وجہ سے مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ تو باغبانپورہ کو بھی حق قرابت ادا کرنے کے لئے پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ باغبانپورہ بھی ایک متمول موضع تھا۔ وہاں کئی پشتوں سے شاہی داروغہ چلے آتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی بے لگام و حریص فوجیں جہاں چار پیسوں کا نام سنتیں۔ پاؤں سر پر رکھ کر دوڑتیں۔ اور جس طرح بھی ہوتا۔ لوٹ کھسوٹ کر واپس آتیں۔ مہر مہنگا کی اولاد سے اُن دنوں دو حقیقی بھائی محلہ خرادیاں لاہور میں آ رہے۔ جب احمد شاہ ابدالی واپس چلا جاتا۔ تو یہ بھی باغبانپورہ میں جا کر آباد ہو جاتے۔ اور جب اس کے آنے کی خبر سنتے۔ تو پھر واپس لاہور آ جاتے ٭

احمد شاہ ابدالی کی متواتر یورشوں۔ لڑائیوں اور خونریزیوں کی وجہ سے بیگم پورہ تو تباہ ہو ہی گیا تھا۔ مگر باغبانپورہ میں بھی کوئی متنفس نہ دن کو چین سے رہ سکتا اور نہ رات کو آرام سے سو سکتا تھا۔ بہت سے لوگ ابدالیوں کے خوف سے تتر بتر ہو گئے تھے۔ کچھ دُور دُور کے مواضعات میں چلے گئے تھے۔ گنتی کے چند گھرانے جو باقی تھے وہ بے بال و پر تھے۔ اور اس مصرعہ کا مصداق ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتے ہیں راہزن کو

حافظ لطیف اللہ | انقلاب زمانہ سے خاندان مہر مہنگا کی مالی حالت روز بروز بہت کمزور ہو گئی۔ اس زمانہ میں سکھوں کی رہزنی اور ڈاکہ زنی ابدالی حملوں سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ جو سکھ ڈاکو مالدار ہو جاتا۔ وہ اپنے گاؤں کے گرد چھوٹا سا قلعہ دگڑھی بنا کر رئیس بن جاتا۔ ایسے ہی ایک رئیس کے پاس حافظ لطیف اللہ موضع رن گڑھ

(متصل اٹاری) میں جاکر ملازم ہو گئے۔ اور اُن کے ملازم ہو کر چلے جانے کی وجہ سے باغبانپورہ میں اور بھی بے رونقی ہو گئی

جب لاہور میں سہ حاکمان نے اپنی اپنی حکومت کے لئے لاہور کے حصّے بخرے کرلئے۔ تو شالامار باغ کی طرف کا حصہ لہنا سنگھ احد الحاکم لاہور کو ملا۔ حافظ لطیف اللہ نے اس خیال سے کہ ممکن ہے میرے حقوق آبائی ملوکہ گاؤں باغبانپورہ میں میری غیر حاضری کی وجہ سے بالکل تلف نہ ہو جائیں سکھ سردار کی ملازمت ترک کردی۔ اور قسمت آزمائی کے لئے پھر باغبانپورہ میں آگیا ۔

باغبانپورہ کی دوبارہ سرسبزی | اسی تاریخ سے باغبانپورہ کی دوبارہ سرسبزی و آبادی کا دور شروع ہوتا ہے۔ حافظ لطیف اللہ نے مکانات کی مرمت کرائی۔ زمینوں کو صاف کیا اور ابھی اپنی محنت کا پھل نہ پایا تھا۔ کہ سمت ۱۸۴۷ بکری میں دو فرزند حافظ علیم اللہ و حافظ محمد چھوڑ کر اس دُنیا سے کوچ کر گیا ۔

حافظ لطیف اللہ (یا لطف اللہ) نے باغبانپورہ کی آبادی کے لئے یہ اذن عام دے دیا تھا۔ کہ جو شخص یہاں آکر آباد ہوگا ہمارے مکانات اور ہماری عمارتیں موجود ہیں آباد کار جس پر چاہے حسب حیثیت خود قبضہ کرلے۔ وہ اسی کا مال متصور ہوگا مگر فلاں تاریخ کے بعد مکانات کی رعایت نہ رہے گی۔ یہ سُن کر بہت سے لوگ واپس آگئے اور بہت سے نئے آباد ہو گئے ۔

بموجب تحریر تحقیقات چشتی ۱۲۸۰ھ میں باغبانپورہ کی آبادی ۲۷۸۴ نفوس تھی۔ جن میں ہندو (عورتوں سمیت) صرف ۲۶۳ تھے۔ اور کل گھروں کی تعداد ۸۴۹ تھی ۔

موضع شالاباغ ضلع مظفرآباد

شالامار کے نام سے جس قدر باغات لاہور و کشمیر کے علاوہ بھی معلوم ہو سکے ہیں اُن کی کیفیت لکھی جا چکی ہے۔ کشتواڑ کے پہاڑوں میں ایک ندی شالاباغ کے نام سے ہے۔ اُس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ اب دورانِ تحریر کتاب ہذا میں ایک ایسے شالاباغ کا نام سُنا گیا ہے جو ایک موضع کی صورت میں آباد ہے۔ اس کے متعلق جب خط و کتابت کی گئی تو معلوم ہوا۔ کہ تحصیل مظفرآباد (کشمیر) کے ایک موضع کا نام شالاباغ ہے۔ جو شہر مظفرآباد سے بجانب جنوب دریائے جہلم کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی کُل آبادی دو اڑھائی سو کے قریب ہے۔ اور عرصہ دراز سے آباد چلا آتا ہے اس کے اردگرد پہاڑ ہیں۔ یہاں پہونچنے کے لئے رستہ بھی پہاڑی ہے۔ لیکن خود یہ موضع ایک میدان مرتفع میں واقع ہے +

تاریخ حریتِ اسلام

اس نادرالوجود اسلامی تاریخ میں اسلامی جانبازوں اور حریت پسندوں کے جرأت آفرین حق آموز صداقت۔ ثابت قدمی اور اسلامی ادب واخلاق کے واقعات مہیا کرنے میں جس محنت وعرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنؤ۔ آغا محمد صفدر بی۔اے۔ ڈاکٹر کچلو بیرسٹرایٹ لا۔ خان بہادر سید اکبر حسین سشن جج الہ آباد حضرت خواجہ حسن نظامی خان بہادر شیخ عبدالقادر بیرسٹر سابق جج ہائیکورٹ۔ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب بی ٹی سابق وزیر خارجہ افغانستان مسٹر حسن محمد حیات رجسٹرار مسلم نیشنل یونیورسٹی اور دیگر نامور اہل الرائے لیڈرانِ قوم نے اس کو اسلامی لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ تسلیم کیا۔ اور اسلامی سکولوں کالجوں اور لائبریریوں کیلئے خاص طور پر اس کی سفارش کی ہے۔ اس تاریخ کا مطالعہ ارادوں میں حرکت اور حرکت میں جوش واستقلال پیدا کرتا ہے اور بتاتا ہے۔ کہ ہمارے بزرگ حق پرستی اور ایثار و قربانی پاکیزہ نفسی اور راست گوئی میں کسقدر جرأت ایمانی سے کام لیتے تھے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ ہم دنیا میں جب قابلِ عزت تھے۔ جب ہمارا پرچم دنیا کے ہر حصہ پر لہراتا تھا۔ اور جب ہماری سطوت وشوکت سے شاہانِ عالم کانپتے تھے اس وقت ہم میں کونسی خصوصیت تھی۔ اور آج ہماری ذلت وپستی کی کیا وجوہات ہیں حریت اسلام میں زمانہ رسالت عہد خلافت راشدہ وخلفائے بنی امیہ وعباسیہ عہد بنی بویہ سلجوقیہ دولت ہسپانیہ وغزنویہ کے علاوہ ٹرکی ومصر الجزائر ومراکش۔ فرمانروایانِ ہند (خاندانِ افاغنہ وغلامان و عہد مغلیہ وغیرہ) اور سلمان بادشاہ دکن وسندھ۔ گجرات کشمیر کے عہدہائے گذشتہ کے راستباز۔ حق گو۔ حق پرست بزرگوں کے حیرت خیز جرأت آفرین اور ولولہ انگیز استقلال اور جوش وآثار کے حریت آموز حالات اور عدل وانصاف حریت و مساوات خداترسی وپاکیزہ نفسی کے حامی بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستارانِ حق وصداقت اور فدائے مذہب وملت وعورتوں کے سوانحاتِ عمدہ درج ہیں۔ قیمت .. .. ۳؍

حجم زائد از چار سو صفحہ

المشتہر:-

ظفر برادرس تاجرانِ کتب حلقہ ۲۶ ۔ لاہور